ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
Vol.9. No.1.2026

امن، رواداری اور بین المذاہب ہم آہنگی کے اصول وضوابط آیات قرآنیہ کی روشنی میں

RULES AND REGULATIONS OF PEACE, TOLERANCE, AND INTERFAITH HARMONY IN THE LIGHT OF QUR'ANIC VERSES

ڈاکٹر معظم علی
وزٹنگ فیکلٹی، ماس کیو نیکیشن ڈیپارٹمنٹ، جامعہ پنجاب، لاہور
8648728-0300, 0325-5323736
alimoazzam91@gmail.com

Abstract

Peace, tolerance, and interfaith harmony constitute central ethical and social rules in Islamic teachings, and the Qur'an presents a comprehensive framework for establishing these values within human society. The Qur'anic message emphasizes that peace is not merely the absence of conflict but a holistic state of justice, mutual respect, and moral responsibility among individuals and communities. Through its guidance, the Qur'an lays down fundamental principles such as tolerance and interfaith harmony etc that promote coexistence among diverse religious and cultural groups, ensuring that social relations are governed by compassion, fairness, and respect for human dignity.

Furthermore, the Qur'an strongly condemns aggression, injustice, and oppression, which are considered major obstacles to peace. While self-defense is permitted under specific circumstances, the Qur'an repeatedly stresses restraint, reconciliation, and forgiveness as superior moral choices. Believers are encouraged to repel evil with goodness and to seek reconciliation whenever possible. These teachings establish a regulatory framework that balances justice with mercy and promotes sustainable peace within society.

In conclusion, the Qur'an presents a profound ethical system that promotes peace, tolerance, and interfaith harmony as essential elements of social life. By emphasizing human dignity, freedom of belief, justice, and respectful dialogue, the Qur'an provides enduring principles for building harmonious relationships among diverse communities. These teachings remain highly relevant in the modern world, offering valuable guidance for addressing religious tensions and fostering peaceful coexistence in pluralistic societies.

Key words: *Inter faith harmony, social relations, Self-defense, forgiveness and human dignity.*

تعارف

اسلام! ایک آفاقی دین ہے۔ اِسے دین فطرت بھی کہا جاتا ہے اور فطرت سے عمومی طور پر ایسے اصول وضوابط مراد لیے جاتے ہیں جو بنیادی طور پر یکساں نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اُن کا تعلق کسی خاص مذہبی، سیاسی، سماجی، معاشی اور علاقائی حدود سے نہیں ہوتا، اُن کا مطمع نظر صرف انسان اور اُسی کی اصلاح رہتا ہے۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ جن قواعد وضوابط کو عقلی لحاظ سے فطری کہا جاتا ہے یا کہا جائے گا وہ تعصب، نفرت، تشدد، بغض وحسد اور ذاتی انا و تکبّر سے ماوراء ہوں گے جن کے پیش نظر صرف انسان ہو گا اور سبھی انسانوں کو ایک ہی پیمانے کے مطابق جزا و سزا سے نوازہ جائے گا کسی کو پسندیدہ، محبوب یا قرب خاص کا سرٹیفکیٹ نہیں دیا جائے گا کہ جس سے اُن متعین شدہ اصول کا جھکاؤ معلوم ہو اور لوگ آہستہ آہستہ متنفر ہونے لگ جائیں کہ یہ نظام تو صرف خاص الخاص افراد کو نوازے جانے کے لیے وضع کیا گیا ہے عام رعایا سے اِسے کوئی سروکار نہیں۔

لہٰذا یہ کہنا بعید از قیاس نہ ہو گا کہ فطری قواعد وضوابط صرف وہی ہو سکتے ہیں جن میں کسی فریق کی طرف جھکاؤ نہ ہو، سبھی کو یکساں اصولوں کے مطابق جزا و سزا سے نوازہ جائے، کسی کے لیے رنگ، نسل، علاقہ، فرقہ، جماعت یا گروہ کی بنیاد پر قانون کو تبدیل نہ کیا جائے کسی ایک فریق کی اجارہ داری نہ ہو کہ لوگ امن سے رہنے کے لیے مجبور کر دیے جائیں کہ ظالم کا ساتھ دیا جائے تبھی بقا ممکن ہو سکتی ہے ورنہ نیست ونابود کر دیا جائے گا۔ اس طرز پر طے شدہ قوانین کو فطری ہر گز نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہی ایسے سماج، معاشرے یا علاقے کو لوگوں کے لیے ایک بہترین جگہ قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ امن، رواداری اور ہم آہنگی کے بنیادی لوازمات مفقود ہیں۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

اس لیے افراد معاشرہ متنفر دیکھائی دیتے ہیں لیکن تاریخ کے صفحات پر کچھ اور طرح کے شواہد بھی مرقوم ہیں کہ جنہیں دنیا منہ چھپانے کو چھت اور زمین پر پاؤں رکھنے کے لیے تِل برابر جگہ فراہم کرنے کو تیار نہیں تھی، انہیں اسلام کے ماننے والوں نے اپنے دامن میں پناہ دی اور مذہبی امور کو سرانجام دینے کی کامل آزادی دیے رکھی جبکہ عصر حاضر میں محسن کُش رویوں کا عملی مظاہرہ بھی غذہ کے مقام پر دیکھ لیا کہ جنہیں امن، رواداری اور ہم آہنگی کا علمبر دار کہا جاتا تھا انہوں نے ظلم وستم کے وہ پہاڑ توڑے جن کی مثال تاریخ انسانی میں ڈھونڈنا ممکنات میں نہیں، اسی طرز پر برما، شام عراق ،یمن، صومالیہ ودیگر علاقوں کو پرکھ لیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ جس مذہب کے ماننے والوں نے دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو ہر سہولت سے نوازے رکھا، وہیں پر آج اُن کی نسلیں ظلم وستم کی چکی میں پس رہی ہیں۔ امن کو شدید خطرات لاحق ہو چکے ہیں کیونکہ کچھ اقوام اس زُعم میں مبتلا ہو چکی ہیں کہ بزور طاقت ہی دوسروں کو سرنگیں رکھ کر امن قائم کیا جاسکتا ہے جس کے لیے تخت وتاج کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی تاراج کر دیا جائے تو کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔

رواداری قصہ پارینہ بنتی جارہی ہے کیونکہ بعض گروہوں کے مفادات اسی سے منسلک ہوتے ہیں، ان کے پیش نظر افراتفری ہی میں ان کی بقا ہے کیونکہ اُن کی ذاتی، گروہی، مسلکی اور معاشی مفادات تخریبی سرگرمیوں سے جڑے ہوئے ہیں جنہیں پورا کرنے کے لیے رواداری جیسے عنصر کو سماج سے مٹانا ضروری ہے اور اس مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے متفرق حیلے وحربے استعمال کیے جاتے ہیں جیسا کہ کسی کو غربت کا خوف دلا کر ورغلایا جاتا ہے اور بڑی گاڑی، بنگلہ، نوکر وچاکر جیسی خواہشات کو مزین کر کے ان کے نوزیدہ خوابوں کو چرایا جاتا ہے اور پھر مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں ۔کسی کو بہتر ومحفوظ مستقبل کے لالچ میں پھنسالیا جاتا ہے اور کسی کو اخروی انعامات کے حسین خواب دیکھا کر شطرنج کے کھیل کی طرح استعمال کر لیا جاتا ہے۔ لہذا رواداری جیسا مفید عنصر بھی لوگوں کے درمیان سے غائب ہوتا جارہا ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ زیادہ متشدد، متعصب اور خون خرابے کے متلاشی بنتے چلے جارہے ہیں جس کے بارے میں اہل حل وعقد کو سنجیدگی سے غور وفکر کرنا چاہیے ۔اسی طرح معاشرے میں باہمی ہم آہنگی کا رجحان بھی مفقود ہوتا جارہا ہے کہ فریق مخالف کی فکر صرف اس وجوہ سے رّد کر دی جاتی ہے کیونکہ اس کا تعلق کسی اور مذہب ومسلک سے ہے۔ کسی کا تعلق، کم تر سمجھی جانے والی ذات، قوم وقبیلہ سے ہے اس لیے اُسے پرکاہ کی وقعت نہیں دی جاتی۔

حالانکہ دوسرے فریق کے نقطہ نظر کو قبول نہ بھی کیا جائے اس کے لیے اتنی گنجائش ضرور رکھی جانے چاہیے کہ جس کی بنا پر اُسے قصور وار ٹھرانے سے قبل اُس کے فہم کا ادراک کر لیا جائے۔ اُس زیر بحث معاملے میں معذور سمجھ لیا جائے، کم عمری وکم علمی کے درجے میں رکھ کر قابل اصلاح گردانا جائے، وقتی طور پر جذبات کے زیر اثر ہوش حواس سے خالی تسلیم کر لیا جائے تو اس میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے متعدد مواقع کو پروان چڑھایا جاسکتا ہے لیکن حقیقت حال کچھ اور عوامل کی طرف اشارہ کرتی دیکھائی دیتی ہے کہ کن کو ہم آہنگی پیدا ہونے سے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں؟ اور کن کے مفادات پر کاری ضرب پڑ سکتی ہے؟ اگر لوگوں کو ہم آہنگ رہنے کا درس دیا جائے۔

لہذا طائرانہ نظر سے مشاہدہ کیا جائے تو ایک چھوٹے سے گاؤں سے لے کر دنیا کے وسیع میدانوں تک، فرد واحد سے لے کر پوری نسل انسانی کے اجتماعی مفادات تک، ملکی سطح سے لے کر بین الممالک تک سبھی جہات سے ایک ہی پہلو عیاں تر ہوتا نظر آتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح امن، رواداری اور بین المذہب ہم آہنگی کو فروغ دیا جائے اور آگ کے گھڑے پر کھڑے اجتماعی سماج کو بچانے کی تگ ودو کی جائے تاکہ نسل انسانی کو محفوظ رکھا جاسکے جس کے لیے سبھی مذاہب، معاشروں اور جماعتوں کو اجتماعی طور پر کوششوں کا بروئے کار لانا ہو گا تبھی اِس ہدف کو قابل حصول بنایا جاسکتا ہے جس کے لیے اسلام کی دامن میں ہدایات کا ضخیم ذخیرہ موجود ہے جس سے ہر کس وناکس مستفید ہو سکتا ہے اور اس کے لیے قرآن حکیم کو بنیادی مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ لہذا اسلامی نقطہ نظر سے قرآن حکیم اولین رہبر ورہنما ہے جو امن، رواداری اور بین المذاہب ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے کلیدی کردار ادا سکتا ہے جس کے لیے چار وناچار سبھی انسانوں کو جلد یا بدیر اس کی طرف رجوع کرنا ہی پڑے گا

امن، رواداری اور بین المذاہب ہم آہنگی قرآنِ حکیم کے فکری واخلاقی نظام کی تین اساسیات میں سے ہیں۔ یہ اصول انسانی زندگی کے روحانی، اخلاقی اور سماجی پہلوؤں کو ایک جامع اخلاقی ڈھانچے میں جوڑتے ہیں۔ قرآنِ مجید امن کو صرف جنگ کے خاتمے کے معنی میں نہیں بلکہ ایک مثبت حالت کے طور پر پیش کرتا ہے جو عدل، احسان، صبر اور باہمی احترام سے تشکیل پاتی ہے۔ رواداری اور بین المذاہب ہم آہنگی قرآن کی اس الہامی بصیرت سے جنم لیتی ہیں جس کے مطابق انسانی تنوع دراصل خدائی حکمت کی نشانی (آیۃ) ہے۔ یہ مطالعہ قرآنی اصولوں کو ان کے اخلاقی اور فقہی سیاق و سباق میں پیش کرتا ہے تاکہ جدید دنیا میں امن وبقائے باہمی کے قیام میں ان کی معنویت واضح ہو۔

لہذا! قرآن، نورِ ہدایت ہے۔ منبع معرفتِ الٰہی ہے۔ سیل رواں ہے۔ بحر بے کنار ہے۔ اسلام قبول کرنے والوں کے لیے کامیابی وکامرانی کی راہ گزر ہے۔ ایمان لانے والوں کے لیے ہمسفر ہے۔ ایقان رکھنے والوں کا نورِ نظر ہے۔ راہِ سلوک کے متلاشیوں کی مطلوب منزل ہے اور عشّاق کے لیے راحتِ قلب ونظر ہے۔ اسی نے مفکرین کی فکر کو جلا بخشی، متکلمین کو منطق سیکھائی، مبلغین کو طرزِ کلام بخشا، خطبا کو جوش خطابت سے نوازہ، منکرین کو دعوت فکر دی، مجتہدین کے لیے نئے در وا کیے، شارحین کو شرح صدر بخشا۔ مذکورہ سابقہ تو کجا کہ شعراء، ادیب، مؤرخین، ماہرین ارضیات وفلکیات الغرض کونسا طبقہ فکر ہے جو اس سے مستفید نہیں ہو رہا۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

کوئی ایسا پیاسا ہے جو اس کے پاس آیا ہو اور اس کی من چاہی پیاس نہ بجھائی ہو۔ لیکن کیا جو سبھی کی الجھنیں سلجھائے جا رہا ہے، اس کے دامن میں امن، رواداری اور بین المذاہب ہم آہنگی کی فضا کو قائم کرنے کے لیے ہدایات کے چند نمونے موجود ہیں؟ کچھ اصول وضوابط پنہاں ہیں کہ جن سے رہنمائی لے کر آگ کے دھانے پر لڑکھڑاتے سماج کے وجود کو بچایا جا سکے جسے بدامنی، عدم برداشت اور تعصب وتنگ نظری جیسے عوارض سر تا پا لاحق ہو چکے ہیں جن کی وجہ سے جسم لاغر ہو چکا ہے اور مزید بوجھ اٹھانے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ لہذا پیش نظر مقالہ میں انہی عوامل کی تلاش میں قلمکار سرگرداں رہے گا تاکہ انہیں سپردِ قلم کیا جا سکے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے تجزیاتی اسلوب تحقیق کو بروئے کار لایا جائے گا تاکہ اخذ کئے جانے والے اصولوں کو سماجی سطح پر منطبق کیا جا سکے اور اصلاحِ احوال کی مسدود ہوتی راہوں کو کشادہ کیا جا سکے۔

اسلام کا پیغام عالمگیر ہے جو نسل، قوم اور جغرافیہ کی تمام حدود سے ماوراء ہے۔ لفظ اسلام عربی مادہ س-ل-م سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں امن، سلامتی اور اطاعت۔ اسی لئے امن اسلام کی اصل روح ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا

الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ[1]

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ محفوظ رہیں

عصر حاضر میں جب مذہبی اور فکری شدت پسندی نے انسانی معاشروں کو تقسیم کر رکھا ہے، ایسے وقت میں قرآن کے اصولِ امن، رواداری اور بین المذاہب ہم آہنگی کی طرف رجوع وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ یہ مقالہ انہی قرآنی اصولوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتا ہے تاکہ عملِ انسانی کو جانچا و پرکھا جا سکے کہ کس مقام پر وہ دھوکے میں مبتلا ہے اور کہاں پر اُس کے افکار وخیالات دھندلا چکے ہیں جنہیں دوبارہ سے کانٹ وچھانٹ کے مراحل سے گزار کر حقیقی شکل میں منظم ومرتب یا جا سکتا ہے اور کارہائے حیات کو سنوارنے میں مدد لی جا سکتی ہے۔ ذیل اُنہی جہات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

اسلام میں تصورِ امن

امن کا لفظ سلامتی، سکون، حفاظت، اطمینان اور صلح وامان کے مترادفات کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس سے عیاں ہوتا ہے کہ یہ غیر مرئی مگر مظاہر سے پہچان لیا جانے والا اور مطلوب عوامل میں شمار کیے جانے کے قابل عمل ہے کہ یہ خود ساختہ انداز میں کہیں سے بھی برآمد نہیں ہوگا اور نہ ہی یہ عنصر دنیا کی کسی منڈی میں، کسی ساہوکار کے پاس یا کسی سرمایہ دار کی تجوری میں محفوظ پڑا ہوگا کہ جب بھی درکار ہوگا، وہاں سے لا کر پیش کر دیا جائے گا اور پھر چہار سُو امن ہی امن کا دور دورہ ہو جائے گا۔ ایسا ہونا گمان وبیان میں تو ممکن بنایا جا سکتا ہے مگر عملی صورت میں کوہِ گراں است۔

لہذا! اِس کی طلب ہی اِس کی طرف پیش رفت کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے اور جہاں طلب پیدا ہو جائے وہاں رسد کا تصور بھی اجاگر ہوتا ہے اور جب طلب ورسد کو باہم جوڑ دیا جائے تو دو فریق کا خاکہ ابھر کر سامنے آتا ہے تاکہ واضح کیا جا سکے کہ طلب کون کر رہا ہے اور رسد کس کی طرف سے پہنچائی جائے گی؟ اور جب اس سلسلہ بحث کو دراز کیا جائے تو عیاں ہوتا چلا جائے گا کہ قیام امن کے لیے دونوں اطراف سے طلب ورسد کا ہونا لازم وملزوم ہے تاکہ ایکدوسرے کی ضرویات وخواہشات کو پورا کیا جا سکے جس سے ثابت ہوا کہ جہاں امن کی ضرورت ہوگی وہاں دو فریقین موجود ہوں گے جو باہم امن وسکون اور صلح وسلامتی کے ساتھ رہنے کے خواہاں ہیں۔

ایسا ممکن ہی نہیں کہ ایک طرف طلب کی صورت میں امن کے قیام کی صدا باصحرا بلند ہوتی رہے اور دوسری طرف سے مطلوب رسد پہنچانے کی بجائے سلامتی وامان کا صرف راگ الاپا جائے جبکہ عملی طور پر تخریبی وسازشی کاروائیاں جاری رکھی جائیں لہذا کہا جا سکتا ہے کہ امن یک رنگی کا متقاضی ہے اس میں جزووقتی کی گنجائش نہیں کہ کسی لمحہ طے شدہ شرائط کو لاگو کر لیا جائے اور قیام امن کو یقینی تصور کر لیا جائے اور پھر اچانک من چاہے اہداف کے حصول کو ممکن بنانے کے لیے معاہدات کو پسِ پشت ڈال کر اہداف کو نشانہ بننے لگیں اور تخریبی عوامل کو بروئے کار لایا جائے۔ امن کا قیام تب بھی ممکن نہیں جب دونوں فریقین میں طبقاتی اختلافات کی گہری خلیج حائل ہو کہ ایک کے پاس قوت وطاقت کے سبھی وسائل ہمہ وقت میسر ہوں اور فریقِ مخالف کو حربی خواہش کی بجائے صرف اپنا نان ونفقہ پورا کرنے کی پریشانی لاحق ہو۔ یہاں قانون کا نفاذ قیام امن کو یقینی بنانے میں اپنا اثر ورسوخ دیکھاتا ہے۔ قیام امن کے لیے اٹھائی گئی سبھی کوششیں تب بھی رائیگاں جائیں گیں جب معاہدات کی تمام شقیں کسی ایک فریق کے حق میں ملتزم کر دی جائیں اور فریق ثانی کو مجبور ولاچار کر دیا جائے کہ اُسے بہر صورت طے شدہ شرائط کو قبول کرنا اور پابند رہنا ہے۔

امن کو استحکام تبھی ممکن بنایا جا سکتا ہے جب دونوں اطراف یکساں طور پر قواعد کا نفاذ کیا جائے اور برابری کی سطح پر نکاتِ معاہدہ کو تحریر میں لایا جائے اور پھر تجاوز کرنے والے کے خلاف مثبت ومؤثر تادیبی کاروائیوں کو بروئے کار لانا یقینی بنایا جائے۔ مذکورہ بالا تمہیدی بحث کے بعد قرآن حکیم سے امن وامان کے قیام واستحکام کے حوالے سے بیان کردہ ہدایات کو سپردِ قلم کیا جائے گا تاکہ ان فرامین سے مستفید ہونے کے لیے عملی اقدامات اٹھائے جا سکیں۔

1 ۔ بخاری، محمد بن اسماعئیل۔ صحیح بخاری۔ مصر: السلطانیہ بالمطبعہ الکبرٰی الامیریہ ببولاق 1311ھ، ج 1، ص11، رقم الحدیث: 09

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

1۔ ظاہر و باطن کا یکسو ہونا

قرآن حکیم، اسلام کی اتباع کرنے والوں سے تقاضا کرتا ہے کہ جب امن والے دین میں داخل ہو گئے ہو تو پھر ظاہر و باطن میں تضاد نہیں ہونا چاہیے۔ جیسی کیفیات ظاہری حلیے سے نظر آتی ہوں، دلی معاملات اس پر مہر تصدیق ثبت کریں۔ منافقانہ طرز عمل کو اسلام میں ہر گز گوارہ نہیں کیا جاتا کہ لوگوں سے میل وملاپ میں انسان ظاہر و باطن میں تضادات کا مجسمہ بنا پھرتا ہو کہ جو زبانِ قال سے ادا ہوا، زبانِ حال اس کا ساتھ نہ دے رہی ہو۔ اسی لیے اہل اسلام سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ[2]

اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

مذکورہ سابقہ آیت مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ دین اسلام کی اتباع کرنے والوں کو تبلیغ کی گئی ہے کہ اس اسلام میں کامل طور پر داخل ہو جائیں، امن والے دین پر مکمل طور پر عمل پیرا ہوں ۔ایسا ممکن نہیں کہ اپنی خواہشات، ترجیحات، ترغیبات کو بوقت ضرورت فوقیت دی جائے اور اسلام کے واضح احکام کو پس پشت ڈال دیا جائے اور امن کے قیام کے لیے کی جانے والی کوششوں کو رائیگاں کر دیا جائے لہذا جب ایسے " اسواۃ حسنہ " کی پیروی زندگی کا لازمی جزو بن جائے کہ جو افراد، خاندان، سماج و معاشرہ، اقوام و ملل کے درمیان امن و آشتی کا ماحول فراہم کرنے کے لیے واضح ہدایات کا سرچشمہ ہو تو پھر ذاتی رجحانات غالب نہیں آنے چاہیے اور راحت و سکون کی فضا کو پنپنے کا موقع دینا چاہیے تاکہ کرّہ ارض کو امن کا گہوارہ بنایا جا سکے۔

2۔ انسانی جان کی حرمت

قبل از ظہور اسلام فی العرب، سماجی سطح پر قصاص و دیت وغیرہ کا کوئی منظم نظام موجود نہیں تھا کہ جس کے ذریعے افرادِ معاشرہ کو عدل و انصاف فراہم کیا جا سکے۔ قتلِ حق و ناحق کے ابحاث کسی قانونی بحث کی متقاضی ہوتی ہیں لیکن جہاں طاقت و قوت کے بل بوتے پر ظلم و ستم کو روا رکھنا ہی قانونی حیثیت اختیار کر جائے وہاں عدل و انصاف کے قیام کا تقاضا کرنا کار بیکار است۔ لہذا جب ایک طرف صرف استحصالی قوتوں کا اجتماع ہو گا اور دوسری طرف ظلم و ستم کی چکی میں پستہ ہوا طبقہ تو وہاں امن، سکون، راحت اور اطمینان قلب کی چہ مگوئیاں کرنا خام خیالی کے زُمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ جلد یا بدیر وہاں کا سماجی ڈھانچہ تصادم کا شکار ہو گا اور پہلے سے بڑھ کر ظلم و ستم کو جائز قرار دے لیا جائے گا لہذا سماجی ساخت کو برقرار رکھنے کے لیے عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا بنیادی فریضہ ہے کہ جس کے بغیر امن کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

اسی طرز کی معاشرتی ناہمواری کا سامنا اسلامی تعلیمات کو بھی درپیش تھا جس کے تدارک کے لیے عدالت کے قیام کے ساتھ ساتھ فریقین کو قصاص و دیت جیسے اصلاحی عوامل سے بھی روشناس کروایا گیا تاکہ مختلف طبقات میں عدم موافقت کا ماحول پروان نہ چڑھے اور باہمی اخوت کے رشتے کا تقدس برقرار رکھتے ہوئے سبھی مل جل کر رہیں جس کے لیے قرآن مجید نے درجہ ذیل سنہری اصول متعارف کروایا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ[3]

وہ جس نے کسی جان کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے بدلے کے بغیر کسی شخص کو قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک جان کو (قتل سے بچا کر) زندہ رکھا اس نے گویا تمام انسانوں کو زندہ رکھا

اسی بحث کے دوسرے پہلو "قصاص" کو عدالتی یا مقامی نظام کے ذریعے قائم کرنے کے حوالے سے ہدایات جاری فرمائیں کہ

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ[4]

اور ہم نے تورات میں ان پر لازم کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت (کا قصاص لیا جائے گا) اور تمام زخموں کا قصاص ہو گا پھر جو دل کی خوشی سے (خود کو) قصاص کے لئے پیش کر دے تو یہ اس کا کفارہ بن جائے گا اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

2-البقرۃ 2: 209
3 -المآئدہ 5: 32
4-المآئدہ 5: 45

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

مندرجہ بالا آیات میں بیان کردہ اصول، انسانی زندگی کی حرمت کو مذہب و قوم سے ماورا ایک عالمگیر قدر کے طور پر بیان کرتا ہے کہ انسانی جان اسلام کے نزدیک کس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ سبھی سود وزیاں سے بڑا نقصان، بڑی ہلاکت ایک انسان کو ناحق قتل کرنا ہے۔ لہٰذا اسلام اپنے متبعین کو نہ صرف قولی طور پر تبلیغ کرتا ہے بلکہ عملی اقدامات کے حوالے سے بھی لائحہ عمل بتاتا ہے تاکہ مثبت وتعمیری نتائج حال کئے جاسکیں اور قول وفعل کا تضاد پنپنے نہ پائے۔

3۔ امن کی بنیاد: عدل وانصاف کا مضبوط نظام احتساب

فرد، خاندان اور سماج کی انفرادی واجتماعی سطح پر بھلائی کے لیے مضبوط و مستحکم نظام عدل وانصاف کا قیام ناگزیر ہوتا ہے۔ اسی کے سبب معاشرے ترقی کے مدارج پر کامیابی سے چڑھتے ہیں اور اسی نظام میں افراط وتفریط کے در آنے سے تنزلی وپستی کی گہرائیوں میں جا گرتے ہیں۔ قولِ فیصل ہے کہ معاشرے کفر وشرک کے ساتھ قائم رہ سکتے ہیں لیکن نظام عدل وانصاف کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا امن کو پروان چڑھانے کے لیے ہر کس وناکس کو بالآخر اس نظام کے کندھوں کا سہارا لینا پڑے گا تبھی ناممکن کو ممکن بنایا جاسکتا ہے بصورت دیگر سعی لاحاصل کے سوا کچھ نہیں۔

اسی بحث کی دوسری جہت کا تعلق مضبوط نظام احتساب سے ہے جس کے ذریعے غافلین کو خبر دار کیا جاتا ہے، عاملین کے عمل کو جانچا جاتا ہے اور ظلم وستم کا رویہ اختیار کرنے والوں کو کٹہرے میں کھڑا کر کے عدل وانصاف کے تقاضوں کے مطابق سزا کے مراحل سے گزارہ جاتا ہے تاکہ اصلاح احوال کو ممکن بنایا جائے اور امن کو پنپنے کا موقع ملے جبکہ بسا اوقات مشاہدہ میں آتا ہے کہ نظام عدل وانصاف کو بڑی عرق ریزی سے، کانٹ وچھانٹ کے مراحل سے گزار کر تشکیل دیا جاتا ہے لیکن عملی لحاظ سے اثرات نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتے۔ کیا وجوہات ہوسکتی ہیں کہ ہر طرف انصاف کا بول بالا سنائی دیتا ہے؟ چہار سُو ڈنکا بج رہا ہے، زبان زد عام ہے کہ نظام عدل ونصاف سے بچ پانا اب ممکن نہیں رہا جو غلط کرے گا، سزا پائے گا۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے لیکن جب حقائق کا جائزہ لیا جائے تو اندرونِ خانہ سبھی تخریبی عوامل اپنا اپنا حصہ بقدر جثہ بٹور رہے ہیں، ظلم وستم کا بازار گرم اور کوئی مظلوم درد سے کراہنے کی سکت بھی نہیں رکھتا اور نہ ہی اُسے اجازت دی جاتی ہے آہ وفغاں کر سکے۔

لہٰذا ایسے احوال کے پسِ منظر میں احتسابی مراحل کی شفافیت پر سوال اٹھتا ہے کہ کہیں نہ کہیں دوران احتساب عدل وانصاف کے تقاضوں سے روگردانی کی گئی ہے۔ کسی کی پشت پناہی کی گئی ہے یا کسی فریق کی طرف منصب عدالت پر فائز شخصیات کا جھکاؤ ہے یا جو وکالت کے فرائض سرانجام دے رہا ہے اس کی طرف سے مقدمہ پیش کرنے میں سستی، عجلت، کاہلی ودیگر اسباب کے باعث خامی رہ گئی ہے یا پھر فریقین اپنے اپنے اثر ورسوخ کو بروئے کار لاتے ہوئے مقدمہ پر اثر انداز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے تمام کاروائی اصل مقصد سے ہٹ کر دیگر مقاصد کے حصول کی طرف رُخ موڑ لیتی ہے جو کبھی مطلوب ومقصود نہیں ہوتے اور یوں سبھی کاوشیں رائیگاں چلی جاتی ہیں جو سماج پر منفی اثرات مرتب کرتی ہیں جبکہ نظام عدل وانصاف ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم جیسی کیفیات میں مبتلا گم وصم کھڑا ہوتا ہے۔

لہٰذا جہاں نظام عدل وانصاف کا مضبوط ہونا ضروری ہے وہیں نظام احتساب کا شفاف ہونا بھی ناگزیر ہے تاکہ انصاف ہوتا نہ صرف سنائی دے بلکہ عملی طور پر دیکھائی بھی دے اور قرآن حکیم میں اسی طرز کی حساسیت کو مقدم رکھتے ہوئے امن کے قیام کے لیے عدل وانصاف پر زور دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا[5]

اے ایمان والو! اللہ کے لئے گواہی دیتے ہوئے انصاف پر خوب قائم ہو جاؤ چاہے تمہارے اپنے یا والدین یا رشتے داروں کے خلاف ہی (گواہی) ہو۔ جس پر گواہی دو وہ غنی ہو یا فقیر بہر حال اللہ ان کے زیادہ قریب ہے تو (نفس کی) خواہش کے پیچھے نہ چلو کہ عدل نہ کرو۔

اسی موضوع کو دوسرے مقام پر ایک انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ[6]

بیشک اللہ عدل، احسان اور رشتے داروں کو دینے کا حکم فرماتا ہے اور بے حیائی اور ہر بری بات اور ظلم سے منع فرماتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

پس واضح ہوا کہ عدل وانصاف سماجی امن وتوازن کی بنیاد ہے، اور ظلم وستم کسی بھی معاشرے میں فساد کی جڑ۔ لہٰذا قیام امن کے لیے اس کا مضبوط ہونا از حد ضروری ہے تاکہ فلاح واصلاح احوال کا تسلسل برقرار رہے اور لوگ باہمی عزت وحترام سے گزر بسر کر سکیں۔

5۔النسآ 4: 135
6 ۔النحل 16: 90

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

4۔ صلح اور عفوودرگزر

انسان کے باہمی معاملات میں اتار وچڑھاؤ آنا معمولِ عام ہے کبھی خوشی کا سماں چھایا ہوتا ہے اور کبھی غم کے گہرے بادل سایہ فگن ہوتے ہیں۔ کبھی دھوپ انسانی طبیعت کو سرشار کر دیتی ہے اور کبھی رات کا اندھیرا اُداسیوں کی گہرائیوں میں لاکھڑا کرتا ہے لہذا یہ کہہ پانا کہ انسانی طبیعت مستقلاً ایک جیسی کیفیات میں مبتلا رہ سکتی ہے تو بعید از قیاس ہو گا کیونکہ نہ تو شواہد اس کی غمازی کرتے ہیں اور نہ تجربات سے یہ بات ثابت ہو پائی ہے جس سے عیاں ہوا کہ جب انسان فطرتاً یکساں کیفیات کا متحمل نہیں تو اس سے جڑے امورِ زندگی میں یکسانیت کا پایا جانا بھی ممکنات میں سے نہیں سوائے چند مستثنیات کے۔اور جب امورِ زندگی میں ردّوبدل ہوتا ہے تو لامحالہ خود سے جڑے دوسرے انسانوں کے معمولاتِ زندگی میں بھی تغیّر رونما ہو جاتا ہے جو کبھی تو مطابقت پیدا کرتا ہے، کبھی مسابقت اور کبھی مخالفت۔

لہذا اگر مطابقت پیدا ہو جائے تو فریقین میں ذہنی آسودگی کا عنصر غالب تر ہو جاتا ہے اور باہمی معاملات پہلے کی نسبت زیادہ معتبر اور مضبوط ہوتے چلے جاتے ہیں اور اگر مسابقت کا عنصر نمایاں ہو جائے تو ممکنات میں سے ہے کہ دیگر افراد کے دلوں میں اچھے جذبات و نیک خیالات دعاؤں کے صورت میں اُمڈ آئیں اور متعلقہ انسان کامیابیوں کی مزید بلندیوں کی طرف گامزن ہو جائے جبکہ معاملہ اس کے برعکس بھی ظاہر ہو سکتا ہے کہ ایک دوست روز مرّہ امور میں سبقت لے گیا ہے تو جس سے پیچھے رہ جانے والوں کے ذہنوں میں بغض وحسد اور نفرت وعداوت پیدا ہو جائے اور تعلقات میں میں دراڑ آتی جائے جو کہ کسی بھیانک انجام کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

اور اسی سے بحث منسلک تیسرے پہلو یعنی مخالفت کے بارے میں بھی پیدا ہونے والے خدشات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جب ایک ہی وقت میں اور ایک ہی مقام سے ،ایک ہی منزل کی جانب سفر کا آغاز کرنے والوں میں سے کچھ افراد منزلِ مقصود پر پہلے پہنچ جائیں اور کچھ کو زیادہ وقت لگے یا انہیں پہنچنے میں دیر ہو جائے تو پیچھے رہ جانے والے مخالفانہ رویہ اختیار کر لیں، بدگمانیاں پالنے لگیں ،انتقامی جذبات پروان چڑھنے لگیں تو خدشات ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ باہمی معاملات پہلے جیسی ڈگر پر نہیں چل سکیں گے لہذا رفتہ رفتہ فاصلے بڑھنے لگتے ہیں ،وسوسے پنپنے لگتے ہیں اور دشمنی جیسی قبیح حرکات کا ارتکاب کیا جانے لگتا ہے جس سے دو افراد، معاشرے یا سماج ارادی یا غیر ارادی طور پر ایکدوسرے کے مد مقابل کھڑے ہو جاتے ہیں اور پھر تنازعات کا لامتناہی سلسلہ چل نکلتا ہے جو بعض اوقات کئی مالی وجانی نقصانات کا تاوان وصول کرنے کے بعد بھی تھمتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔

لہذا دیگر مذاہب ومسالک کے ساتھ ساتھ دین اسلام نے بھی قرآن حکیم میں ایسے امور کو احسن انداز میں سلجھانے کے لیے مقابلتاً بہترین اصول بیان کیے ہوئے ہیں جن کی پیروی کرتے ہوئے دنیا میں سلگائے گیے ایندھن کو بجھانے کی مثبت وتعمیری کاوشیں بروئے کار لائی جا سکتی ہیں اور دنیا کو عملی طور پر امن کا گہوارہ بنایا جا سکتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم اپنے ماننے والوں کو ہدایت دیتا ہے کہ انتقام کے بجائے صلح اور معافی جیسے اعمال حسنہ کو پروان چڑھایا جائے جیسا کہ

وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُہَاۚ-فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَى اللّٰہِؕ-اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ[7]

اور بُرائی کا بدلہ اُسی کی برابر برائی ہے تو جس نے معاف کیا اور کام سنوارا تو اس کا اجر اللہ پر ہے بے شک وہ دوست نہیں رکھتا ظالموں کو۔

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَہَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰہِؕ[8]

اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو

مذکورہ بالا آیاتِ قرآنیہ میں معافی، درگزر اور صلح کو اخلاقی قوت اور پائیدار امن کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

5 ۔جارحیت کی ممانعت

جارحیت کا لفظ! حملہ آوری، جنگجوئی، زیادتی یا دوسروں کے حقوق بزورِ طاقت سلب کرنے کے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ تاریخ انسانی ایسے شواہد سے بھری پڑی ہے جن سے عیاں ہوتا ہے کہ قتل وغارت، درندگی اور جارحیت کا چلن جہاں عام رہا وہاں خونِ انسانی ندی ونالوں میں پانی کی طرح بہایا گیا، حرمت جاں کی پامالی کی گئی اور انسانیت کا جنازہ خون میں لت پت بے آسرا گلی وکوچوں میں پڑا رہا جس کا کوئی بھی پُرسان حال نہ تھا اور اس خون ریزی میں نہ تو بزرگ مردوں کا لحاظ رکھا جاتا اور نہ عورتوں کی عزت محفوظ رہتی حتی کہ قدرت کی نعمتوں کا حسین مظہر معصوم بچوں کے جسموں کو بھی نیزوں پر لٹکانے سے بھی ظالم وجابر باز نہ آتے تھے۔

---

7 - الشوریٰ 42: 40
8 -الانفال08: 61

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

ان ظلمت کدوں میں گھرے انسان کو الفت ومؤدت، اتحاد واتفاق اور باہمی اخوت جیسے رشتوں میں باندھنے کے لیے رحمت للعالمین تشریف لائے۔ بزرگوں کا سہارا بنے، عورتوں کے سر پر دست شفقت رکھا، انہیں قبر کی اندھیروں سے نکال کر مرد کے لیے باعث اجر وثواب اور بخشش کا وسیلہ بنایا اور اپنے جان نثاروں کو مژدہ سنایا کہ جو بچیوں کی اچھی تربیت وپرورش کرے گا، عائد کردہ تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے گا اور اُن کی طرف سے آنے والی تکالیف پر صبر وحوصلہ کا مظاہرہ کرے گا وہ کل جنت میں میرا ہمنوا ہوگا۔ کیا انسانی آنکھ نے ایسا بھی کوئی مسیحا دیکھا ہوگا جس نے بلا تفریق رنگ ونسل آقا وغلام کو ایک صف میں کھڑا کر دیا؟ جیسا لباس مالک پہنے ویسا ہی ملازوغلام کو بھی پہنایا جائے، ایسی برابری کے مظاہر بھی کہیں قبل ومابعد دیکھنے کو کہیں ملے اور پھر انؐ کے غلاموں نے ایسے عملی مظاہر پیش کیے کہ خلیفہ وقت گھوڑے کی لگام تھامے اپنی باری پر پیدل سفر کر رہا ہوتا ہے اور غلام وملازم سواری پر سوار ہوتا ہے اور دونوں بیت المقدس کے فتح ہونے کے بعد اس کی کنجیاں وصول کرنے کے لیے تشریف لے جارہے ہوتے ہیں۔ غلاموں کے ساتھ ایسا سلوک نہ تو چشم فلک نے اس سے قبل کہیں دیکھا ہوگا اور نہ ہی آیندہ کہیں تلاش کر پائے گی کہ یہ خاصا ہی خاصان رُسل کا ہے کہ وہی کٹ مرنے کو بھی تیار ہوتے ہیں اور وہی "سمعنا واطعنا" کا عملی مظہر بھی۔

لہذا آج بھی دنیا میں امن کی کوششوں کو جو خطرات لاحق ہیں ان کا مثبت وتعمیری حل اتباع سنتِ رسول ﷺ میں مضمر ہے جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں اور نہ ہی کوئی جائے پناہ ہے۔ لہذا ایک طرف جہاں اسلام اپنے ماننے والوں کو ناانصافی وجارحیت جیسے قبیح افعال سے اجتناب برتنے کی تلقین کرتا ہے وہیں دوسرے مذاہب ومسالک کے ماننے والوں کو بھی راہ اعتدال اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے تاکہ سبھی لوگ امن وسکون سے رہ سکیں اور رواداری کا ماحول پروان چڑھے جس میں سبھی کی جانیں وعزتیں محفوظ ہوں اور کوئی بھی دوسرے سے خطرہ محسوس نہ کرے اور خود کو غیر محفوظ تصور نہ کرے جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْاؕ [9]

اور اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو

فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِیْنَ [10]

پھر اگر وہ باز آجائیں تو صرف ظالموں پر سختی کی سزا باقی رہ جاتی ہے

مذکورہ بالا آیات سے واضح ہوا کہ اسلام میں جنگ دفاعی اقدام کے طور پر مشروع ہے، ظلم وغلبے کے لیے ہرگز نہیں لہذا یہ ایک مسلمہ اصول بنالیا جانا چاہیے تاکہ سبھی اقوام خوشدلی سے اس پر عمل پیرا ہوں۔

6۔ باہمی مکالمہ، معاملہ فہمی اور مذہبی آزادی

قرونِ اولیٰ کی نسبت عصر حاضر میں معاشی، سیاسی، سماجی اور مذہبی رسومات کے دائرہ کار کی ساخت میں بھی خاصی تبدیلی رونما ہوچکی ہے اور اس کی حدود وقیود میں وسعت بھی پیدا ہوچکی ہے۔ دنیا کے ایک کونے میں بسنے والا انسان قطبین کا بُعد ہونے کے باوجود مخالف کونے پر بسنے والے انسان سے بالکل ویسے ہی منسلک ہے، جُڑا ہوا ہے جیسے وہ ساتھ والے گھر کے افراد سے جُڑا ہوا ہے۔ جس طرح ایک انسان انتہائی قریب رہنے والے دوسرے انسانوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اُن کی گفتگو کو سنتا ہے، یعنہ قطبین پر رہنے والوں انسانوں کو بھی دیکھنے وسننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہ معاملہ دوطرفہ ہے یعنی جو صلاحیت ایک مقام پر رہنے والے انسان کو حاصل ہے وہی صلاحیت پوری دنیا میں کہیں بھی رہنے والے انسانوں کو اپنی اپنی استطاعت کے مطابق حاصل ہے۔

لہذا کہا جاسکتا ہے کہ سارے انسان آپس میں منسلک ہیں، جُڑے ہوئے ہیں اور یہ دنیا ایک گاؤں کا روپ دھار چکی ہے۔ اسی لیے کہیں پر بھی ہونے والا کوئی واقعہ چند لمحات کی تاخیر سے دیگر علاقوں وممالک میں رہنے والے انسانوں تک ویسے کا ویسا ہی منتقل ہوجاتا ہے اور وہ بھی اس سے واقف ہوجاتے ہیں۔ جبھی ایک جگہ کی متاثرین کے غم میں دوسری جگہ پر رہنے والے ہمدرد افراد بھی غم میں شریک ہوجاتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہیں اور اس میں کسی مذہب ومسلک یا فرقہ وگروہ بندی کی عمومی طور پر کوئی قید نہیں۔ لہذا یہ ایک مسلمہ اصول بن چکا ہے کہ اگر ایک مقام پر کوئی کارِ خیر انجام دیا جائے گا تو اس سے آگاہی دوسروں کو بھی حاصل ہوجائے گی اور وہ داد وتحسین میں شامل ہوجائیں گے۔ اسی طرح ایک مقام پر کوئی شَر یا ظلم برپا ہوگا تو اُس پر بھی لوگ ملا وجلا ردّ عمل دیں گے لیکن معلومات کو روک پانا یا انہیں بے خبر رکھنا قریباً ناممکن نہیں تو مشکل تر ضرور ہوچکا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ کسی بھی عمل کے حق ومخالفت میں کہیں سے بھی ردّ عمل دیا جاسکتا ہے یا مل سکتا ہے کیونکہ انفارمیشن وٹیکنالوجی کے سبب سبھی ایکدوسرے سے منسلک ہیں۔

9 ۔البقرۃ 02: 190
10 البقرۃ 02: 193

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
Vol.9. No.1.2026

اسی نقطہ نظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب ایک مذہب، مسلک، قوم، قبیلہ یا ملک کے رہنے والے باشندوں پر بھلائیوں کے دروازے کھلتے ہیں تو اِن سابقہ مذکورہ عوامل سے تعلق رکھنے والے دیگر علاقوں میں موجود ہونے کے باوجود اُس مذہب و مسلک، قوم وقبیلہ یا ملک کی طرف کھینچے چلے آتے ہیں تا کہ وہ بھی ان میں شریک ہو سکیں اور بعینہ کوئی ظلم و ستم روا رکھا جائے تو بھی لوگوں کا یہی طرزِ عمل ہو گا۔ جس سے عیاں ہو گیا کہ اب محدود سطح پر نہ تو وسائل کو قید کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی مسائل کو جنم دیا جا سکتا ہے اور اگر کوئی فریق ایسا رویہ اختیار کرے گا تو دیگر متعلقین کی طرف سے شدید ردّ عمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

لہذا عصر حاضر میں اجتماعی مفادات کو مقدم رکھنا ہی بہترین حکمتِ عملی کا عظیم مظہر ہو سکتا ہے کیونکہ اِس سے صرف نظر کرنے کی وجہ سے فسادات کے پھوٹنے کے شدید خطرات لاحق ہو جاتے ہیں جبکہ اس کے برعکس ذاتی مفادات کو ثانوی درجہ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اس لیے یہی قرین قیاس سوجھائی دیتا ہے کہ جہاں جس مذہب و مسلک کی اکثریت ہے، وہاں رہنے والی اقلیتوں کو بھی قانونی لحاظ سے مساوی حقوق دیے جانے چاہیے تا کہ دیگر علاقوں میں اسی مذہب و مسلک کے متبعین جو اقلیت کی صورت میں رہ رہے ہوتے ہیں اُن کی لیے آسانیاں پیدا کی جاسکیں اور وہاں پر انہیں بھی سہولیات فراہم کرنے کا مطالبہ کیا جاسکے۔

اسلامی نقطہ نظر اس حوالے سے بہت واضح ہے کہ یہ اپنے ماننے والوں کو تبلیغ بھی کرتا ہے اور ترغیب بھی دیتا ہے کہ دیگر مذاہب کے رہنے والوں کو انُ کے مذہب کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مکمل طور پر اجازت دی جائے گی اور اسلامی سلطنت کی حدود قیود میں رہتے ہوئے اسلامی قوانین کی پاسداری کرتے ہوئے اپنی مذہبی عبادات میں کامل طور پر آزاد ہوں گے اور اُن پر کسی بھی قسِم کا کوئی جبر نہیں کیا جائے گا کہ وہ اسلام کی دامن میں داخل ہو جائیں اور خود کے مذہب کو ترک کر دیں الّا یہ کہ وہ اپنی مرضی و منشیٰ سے راہ ہدایت کی طرف دل و جان سے راغب ہو جائیں حالانکہ ہر مسلمان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے مذاہب کے افراد اپنی آخرت کی بھلائی کے لیے اسلام کی طرف رجوع کر لیں لیکن اس خواہش کی تکمیل کے لیے انہیں کسی بھی طرح کا ناروا رویہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

اور تاریخی حقائق بھی اس پر شاہد ہیں کہ جب مسلمانوں کی حکومت کا ہر طرف دور دورہ تھا تو غیر مسلم اقوام کے افراد اسلامی سلطنت کی حدود میں زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے جبکہ آج صورت حال مختلف ہو چکی ہے کہ دیگر ممالک میں دوسرے مذاہب کے پیروکار مسلمانوں سے مخالفانہ رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور انہیں یا تو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے یا زندگی کی ضمانت کو ارتداد کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے حالانکہ عصر حاضر کے پُرفتن دور میں بھی کسی مسلم ملک کی طرف سے ایسے ہتھکنڈے استعمال نہیں کیے جاتے اور نہ ہی کوئی فرد ایسے شواہد پیش کر سکتا ہے جبکہ اسلام کے ماننے والوں کے لیے زندگی کا دائرہ محدود کر دیا گیا ہے۔ انہیں دہشت گرد، متنفر اور وحشت کی علامت بنا کر پیش کیا جاتا ہے تا کہ لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا کیا جاسکے کہ مسلمان کا دوسرا نام ہی بربریت و جارحیت ہے۔

لہذا اہل اقتدار و اختیار کو اس حوالے سے مثبت و تعمیری اقدامات کا انتظام کرنا چاہیے تا کہ دونوں اطراف کے مکاتب فکر میں مکالمہ بازی کے ماحول کو پروان چڑھایا جائے اور ایکدوسرے کی عزت و احترام کو مقدم رکھتے ہوئے آپسی امور میں معاملہ فہمی کی روایت کو قائم کرنے میں آسانیاں پیدا ہو سکیں۔ تبھی مذہبی آزادی کا شعور بیدار ہو سکے گا اور لوگ متفرق و متضاد آراء کو خوش دلی سے قبول کرنے کے قابل ہو جائیں گے جبکہ اسلام نے پیش قدمی کے طور پر اس حوالے سے اہل ایمان کو ترغیب بھی دی ہے اور سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں بہترین حکمت عملی بھی فراہم کر رکھی ہے تا کہ کہیں پر بھٹکنے کی نوبت نہ آئے جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُؕ[11]

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اس طریقے سے بحث کرو جو سب سے اچھا ہو

ایک اور مقام پر فرمان الٰہی ہے کہ

لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّۚ[12]

دین میں کوئی زبردستی نہیں، بیشک ہدایت کی راہ گمراہی سے خوب جدا ہو گئی ہے

اہل کتاب سے بحث و مباحثہ کے حوالے سے مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ

وَ لَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ[13]

---

11 -النحل 125:16

12 -البقرۃ 2: 256

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

اور اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر اس طریقے سے جو بہترین ہو۔

مذکورہ بالا آیات قرآنیہ، آزادیِ ضمیر، فکری احترام اور بین المذاہب مکالمے کے اصول کو واضح کرتی ہیں جن کی اتباع کرنے سے امن، رواداری اور مذہبی ہم آہنگی کے ماحول کو پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔

اصولِ رواداری اور ہدایاتِ قرآنیہ

رواداری کا عربی متبادل لفظ "تسامح" ہے جس کا مطلب صبر، احترام اور فراخی دلی سے پیش آنا ہے۔ اسی کے ضمن میں عفو و درگزر جیسے عمل کو بھی زیرِ بحث لایا جاتا ہے کہ جس میں اقتدار واختیار ہوتے ہوئے بھی دوسروں سے درگزر کرنا، انہیں معاف کر دینا وغیرہ جیسے پہلو شامل کیے جاتے ہیں۔ مذکورہ سابقہ الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ رواداری ایک رویہ کا نام ہے اور جب رویّوں کی بابت بات کی جائے تو اس حوالے سے طبقاتی تقسیم کو سب سے پہلے پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے کہ رواداری کا کسی بھی مکتبہ فکر جیسا کہ علمی طبقہ، سیاسی طبقہ، سماجی طبقہ، مذہبی طبقہ اور مسلکی طبقہ سے دور کا واسطہ نہیں ہے کہ جسے ممتاز کر کے اس کے ذمہ لگانے دینے سے باقی ماندہ کی طرف سے فرض کفایہ ادا ہو جائے گا۔

یہ دو افراد، دو مذاہب اور دو طبقات کے درمیان باہمی رویّوں پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ آپسی اتفاقات وتضادات کے لیے کیا بہترین لائحہ عمل مرتب کرتے ہیں؟ کہ جس کے سبب ماحول پُر سکون ہو، لوگ ایکدوسرے سے بلا خطر میل وجول رکھ سکیں، گفت وشنید میں رکاوٹ نہ ہو، دل ودماغ تعصبات سے خالی ہوں اور باہمی احترام کا ایک مضبوط رشتہ قائم ہو۔ ان سبھی عوامل کو رواداری جیسے رویّے کو اپنانے اور طرزِ زندگی کا لازمی جزو بنانے کی باعث ہی ممکن بنایا جاسکتا ہے جس کے لیے ہدایت کا بنیادی سرچشمہ قرآن حکیم کی صورت میں انسانیت کے پاس موجود ہے جس سے استفادہ حاصل کر کے رواداری کو پروان چڑھایا جاسکتا ہے اور ماحول، معاشرہ یا سماج کو امن کا گہوارہ بنایا جاسکتا ہے لہذا اس مقصد کے حصول کے لیے ارشادات الٰہیہ کو ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔

1۔ تنوع کی حکمتِ الٰہیہ

دنیا ارض وسماء مختلف رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کا تنوع ہی دیکھنے والوں کے لیے حیرتوں کے لاتعداد جہانوں کو وا کرتا ہے کہ متفرق ومتضاد عناصر ترکیبی ہونے کے باوصف جب اِن کا سنگم بنتا ہے تو ایک نیا جہاں کیسے وجود پاتا ہے؟ کیسے قوسِ قزاح آسمانی دنیا میں سات رنگوں کا خوبصورت نظارہ پیش کرتی ہے کہ ناظرین محوِ حیرت رہ جاتے ہیں کہ بظاہر نہ کسی مصور کا ہاتھ دیکھائی دیتا ہے، نہ کسی قلم وکاغذ کے چلنے کی آواز کانوں میں پڑتی ہے اور نہ ہی کوئی رنگساز محنت ومشقت کے سبب پسینہ میں شرابور نظر آتا ہے مگر منظر میں سبھی رنگ یکجاں اور منظّم ومرتب دیکھائی دیتے ہیں۔ دیکھنے والوں کو اپنے وہم وگمان میں ہلکا سا جھول بھی سوجھائی نہیں دیتا کہ فلاں مقام پر رنگوں کا تناسب درست نہیں اور فلاں مقام پر رنگ ہلکے پڑ گئے ہیں سبھی کے لیے یکساں منظر اور حیرتوں کا ایک خوبصورت جہاں اپنے دامن میں لیے ہوتا ہے۔

بعینہ کائنات میں ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کا جھرمٹ یہی مناظر پیش کرتا ہے اور یہی سب کچھ زمین پر رہنے والے جانداروں کی رنگت میں بھی دیکھائی دیتا ہے۔ ان گنت مخلوقات خالق ارض وسماء نے تخلیق فرمائی ہیں۔ سبھی کے رنگ الگ، نسل الگ، طرز بود وباش الگ لیکن سنگم ایسا کہ سبھی ایک دائرے میں ایکدوسرے کو سہارا دینے کے لیے موجود رہتے ہیں۔ کسی کے ذمہ گوشت کی صورت میں خوراک فراہم کرنا ہے، کسی کے کندھوں پر مال برداری کا بوجھ اٹھانا ہے اور کسی نے آب وہوا کو آلودہ کرنے والے جراثیم کو تلف کرنا ہے اور یہی فہرست طویل تر ہوتی جائے گی گر سبھی مخلوقات کے فرداً فرداً کاموں اور ذمہ داریوں کو شمار کرنا شروع کر دیا جائے اور موضوع بحث کسی اور پہلو کی طرف رخ موڑ لے گا لہذا مختصراً کہا جائے تو رنگ ونسل کا تنوع بقاءِ حیات کے لیے از حد ضروری امر ہے تاکہ خوبصورتی کے مختلف پہلوؤں سے ناظرین کے روشناس کروایا جاسکے۔ کسی کا رنگ گورا ہے تو اِس میں اس نسل کا خود کا کوئی انتخاب نہیں۔ یہ خالق ومالک دوجہاں کا حتمی فیصلہ ہے کہ اس جاندار کی رنگت گوری کیوں بنائی اور اسی طرح جس کا رنگ کالا ہے تو اُسے بھی ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ وہ ویسا کیوں ہے؟

یہی معاملہ قد وکاٹھ، قوم وقبیلہ اور ملک وعلاقے کا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی فرد کا قد وکاٹھ اتنا چھوٹا یا لمبا کیوں ہے؟ فلاں شخص اُس قوم وقبیلے میں کیوں پیدا ہوا؟ اور فلاں بن فلاں اُس ملک یا علاقے کا پیدائشی طور پر رہنے والا کیوں ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب دینا کسی بھی فرد کے دائرہ اختیار میں نہیں اور نہ کسی کی رضامندی سے ان مذکورہ بالا عوامل سے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اُسے کہاں جانا پسند ہے یا وہ کہاں پیدا ہونا چاہتا ہے۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ حیاتِ انسانی کے کچھ پہلوؤں کا انتخاب اُس کے پاس نہیں اور کچھ پہلو اُس کے حق انتخاب میں رکھے گیے ہیں جیسا کہ کھانے، پینے، پہننے، رہنے اور سوچنے کے حوالے سے اُسے اختیار دیا گیا ہے کہ جیسا طرزِ زندگی چاہے، اُسی کا انتخاب کر لے البتہ ایک بہترین "اسواہ حسنہ" ہمہ وقت اُس کی رہنمائی کے لیے موجود ہے جس سے جب، جہاں اور جیسی رہنمائی درکار ہوگی، اُسے ہمہ جہت دستیاب ہوگی۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

لہذا مذکورہ بالا بحث سے واضح ہوا کہ انسانوں میں رنگ و نسل، قوم و قبیلہ ملک و ریاست اور غور و فکر کا اختلاف موجود ہونا کسی حادثے کا موجب نہیں۔ یہ معمول عام کی بات ہے، نہ کہ اسی اختلاف کو بنیاد بنا کر کسی کے برتر اور کسی کے کم تر ہونے کا فیصلہ کیا جائے اور تفرق کو ہی دونوں فریقین کے لیے ابدی و حتمی تسلیم کر لیا جائے کہ اب یہی زندگی کا مقصدِ تخلیق ہے اور سبھی کو چار ناچار اِسی کے مطابق تاحیات گزر بسر کرنا ہے جبکہ یہیں سے حکمت الٰہیہ کا بھی ظہور ہوتا ہے کہ یہ سب اُسی کی کارسازی ہے کہ اُس نے ہر رنگ و نسل اور ہر علاقے میں رہنے و گزر بسر رنے والے انسانوں کو تخلیق فرمایا۔ اُن کی صلاحیت واستطاعت میں تنوع رکھا تاکہ سماجی زندگی میں سبھی ایکدوسرے کے کام آسکیں اور معاشرہ یگانگت کا منظر پیش کر سکے اور یہی سب کچھ دین اسلام کو بھی مطلوب و مقصود ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا-وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ[14]

ہم نے تم سب کے لیے ایک ایک شریعت اور راستہ بنایا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر (اس نے ایسا نہیں کیا) تاکہ جو (شریعتیں) اس نے تمہیں دی ہیں ان میں تمہیں آزمائے تو نیکیوں کی طرف دوسروں سے آگے بڑھ جاؤ۔

اور ایک امت، گروہ یا جماعت کی تشکیل نہ کرنا بھی اسی کی مرضی و منشا میں سے ہے۔ اُس خالق و مالک نے سبھی انسانوں کو مختلف رنگ و نسل کا پیدا فرمایا تاکہ تنوع موجود رہے اور ایکدوسرے کے لیے قوم و قبیلہ کی بنیاد پر ردّ و قبول کے عوامل کی بیخ کنی کی جا سکے جبکہ اس کے برعکس ظاہری رنگ و صورت کی بجائے ابدی اور حقیقی مقاصد کو بیان فرمایا گیا تاکہ انسان یہ جان سکے کہ آخری انجام کیا ہونا ہے؟ اور اسی کے مطابق جزا سزا کا فیصلہ کیا جانا ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے کہ

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ-وَ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ [15]

اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں ضرور پوچھا جائے گا۔

جبکہ بارگاہ الٰہی میں عزت و فضیلت کا معیار کسی کا گورا یا کالا ہونا نہیں اور نہ کسی کا عربی کا عجمی ہوتا ہے۔ نہ ہی کوئی مقام و مرتبہ رنگ و نسل یا قوم قبیلہ کی بنیاد پر ملنا طے کیا گیا ہے بلکہ واشگاف الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىٕلَ لِتَعَارَفُوْاؕ-اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْؕ[16]-

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قومیں اور قبیلے بنایا تاکہ تم آپس میں پہچان رکھو، بیشک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے۔

اور فرمان نبوی ﷺ بھی ہے کہ

يا أيها الناس! إن ربكم واحد وإن أباكم واحد، ألا لا فضل لعربي على عجمي ولا عجمي على عربي ولا أحمر على أسود ولا أسود على أحمر إلا بالتقوى[17]

لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے، آگاہ ہو جاؤ! کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سرخ رنگ والے کو کالے رنگ والے پر اور کسی سیاہ رنگ والے کو سرخ رنگ والے پر کوئی فضیلت و برتری حاصل نہیں، مگر تقویٰ کے ساتھ

لہذا طے ہو گیا کہ معیارِ فضیلت تقویٰ ہے اور جانچنے و پرکھنے کا یہ ایسا معیار ہے جس کے ناپنے یا ماپنے کا پیمانہ بنانا یا کسی انسان کے دائرہ اختیار میں نہیں۔ کوئی ایسا انسان موجود نہیں جو تقویٰ کو ناپ یا ماپ سکے کہ فلاں شخص کا تقویٰ ایسا ہے یا اتنا ہے؟ جس سے عیاں ہو گیا کہ ہر فرد کو خود کے اعمال کا مکلف بنایا گیا ہے اور حدود و تعزیرات کے سوا کسی کو اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ قاضی بن کر خود ساختہ فیصلے کرتا پھرے اور اُسے اپنی محدود فکر کے مطابق لاگو کرنے کے لیے مسلح یا غیر مسلح جدوجہد کو دین لابادہ اوڑھائے اور نجات کا حتمی ذریعہ بتائے لہذا مذکورہ بالا آیات مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ اختلاف و تنوع حکمتِ الٰہیہ میں سے ہے جس سے کسی بھی فریق کے لیے آپس میں تصادم کا کوئی جواز نہیں نکلتا بلکہ یہ سب عوامل نیکی و خیر میں باہمی مقابلہ بازی کے لیے مطلوب و مقصود ہوتے ہیں اور اسی نقطہ نظر کو مقدم رکھتے ہوئے سبھی کو کوششیں کرنی چاہیے۔

14 ۔المآئدہ 05: 48
15 ۔النحل 16: 93
16 ۔الحجرات 49: 13
17 ۔محمد الناصر الدین البانی ۔سلسلہ الاحادیث الصحیحہ وشئی من فقههاوفوائدها۔ ریاض : مکتبہ المعارف للنشر والتوزیع 1990ء۔ ج6، ص449، رقم الحدیث 2700۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

2۔عبادت گاہوں کا تحفظ

ہر مذہب کے کچھ شعائر ہوتے ہیں جن سے عیاں ہوتا ہے کہ اس مذہب کے خدوخال کیا ہیں؟ کس ہستی کو برتر مانا جاتا ہے؟ کس کے سامنے سربسجود کیا جاتا ہے؟ کس امر کی تعمیل لازمی ہے؟ کس سے منع کیا گیا ہے؟ اور کب، کتنی دفعہ اور کیسے کوئی مذہبی عبادت بجالانی ہے اور انفرادی واجتماعی معاملات میں مذہبی احکامات وروایات کو کتنا مقدم ومؤقر مانا جاتا ہے۔ یہ کچھ امور ہیں جن کے بارے میں معلوم ہونے سے واضح ہو جاتا ہے کہ فلاں پیروکاروں کا تعلق کس مذہب سے اور ان کا فکری ونظری رویہ کیسا ہو گا؟ لباس، عام چال چلن، کھانا وپینا اور بعض اوقات رہائشی مکانات کی تعمیر بھی دیکھنے والوں کو واضح پیغام دیتی ہے کہ وہاں کس مکتبہ فکر کے ماننے والے سکونت پذیر ہیں۔ انہیں میں سے ایک مرکز عبادت گاہ کو بھی شمار کیا جاتا ہے کہ یہ ایسا مقام ہوتا ہے جہاں سماجی سطح پر بعض اوقات بلا تفریق رنگ ونسل مذہبی رسومات کو ادا کیا جاتا ہے اور اس مذہب کے ماننے والوں کے گہرے جذبات واحساسات اِس مقام ومرکز سے جڑے ہوتے ہیں کہ اگر اِسے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی تو جان ومال داؤ پر لا کر بھی اس کا دفاع کرنا زندگی وموت کا مسلہ بن جاتا ہے۔ لہذا ایسے مقامات کا احترام لازم امر گردانا جاتا ہے تاکہ معاشرے میں رہنے والے سبھی افراد بقائے باہمی کی خاطر، امن واتفاق کو پروان چڑھاتے ہوئے اپنے اپنے مذہبی فرائض باحسن وخوبی ادا کریں اور سکون واحترام کا ماحول پنپتا رہے اور نفرتوں وکدورتوں کے آگے دیواری سکندری کھڑی رہے۔

اسی لیے ہر علاقے وملک میں یہ اصول مسلم سمجھا جاتا ہے کہ دورِ حاضر میں مخلوط معاشرتی ڈھانچے کو برقرار رکھنا ہے تو مخالف مکتبہ فکر کے لیے امن، رواداری اور ہم آہنگی کو فروغ دینا ہو گا بصورت دیگر خطرناک مسائل جنم لے سکتے ہیں جو کہیں اور بھیانک نتائج حاصل ہونے کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں۔ دیگر مذاہب ومسالک سے صَرف نظر کرتے ہوئے مذکورہ سابقہ بحث کو اسلامی نقطہ سے پرکھا جائے تو قرآن حکیم اپنے ماننے والوں کو واضح ہدایات دیتا ہے کہ

وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا[18]۔

اور اللہ اگر آدمیوں میں ایک کو دوسرے سے دفع نہ فرماتا تو ضرور ڈھادی جاتیں خانقاہیں اور گرجا اور کلیسا اور مسجدیں جن میں اللہ کا بکثرت نام لیا جاتا ہے۔

اور یہی طرزِ عمل انسانی جتھوں کے بارے میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ رب تعالیٰ جل شانہ اپنی مرضی ومنشاء کے مطابق کچھ گروہوں کو دوسرے گروہوں کے سبب فتح وشکست سے ہمکنار کرتا رہتا ہے تاکہ ظلم وستم کی روایت کو توڑا جاسکے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے کہ

وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ[19]

اور اگر اللہ لوگوں میں بعض سے بعض کو دفع نہ کرے تو ضرور زمین تباہ ہو جائے۔

لہذا تاریخی شواہد موجود ہیں کہ جب بھی اور جہاں میں اسلام کے سچے پیروکاروں کو نفاذ اسلام کا اختیار حاصل ہوا تو اسلامی سلطنت کی حدود قیود میں دیگر مذہب کی تمام عبادت گاہوں کو تحفظ فراہم کیا گیا اور انہیں اپنی اپنی عبادت گاہوں میں مذہبی فرائض سرانجام دینے کے لیے مکمل آزادی دی گئی۔ لہذا کہا جاسکتا ہے کہ دین اسلام تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کے تحفظ کا ضامن رہا ہے اور تاقیامت رہے گا۔

3۔برائی کا جواب اچھائی سے

حکمت، تدبر اور معاملہ فہمی، انہیں الٰہی انعامات میں سے شمار کیا جاتا ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے کہ

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ-وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا-وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ[20]

اللہ جسے چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جسے حکمت دی جائے تو بیشک اسے بہت زیادہ بھلائی مل گئی اور عقل والے ہی نصیحت مانتے ہیں۔

لہذا جسے بھلائی عطا کی گئی، حکمت ملی، معاملہ فہمی کی صلاحیت ودیعت کر دی گئی، قرآن حکیم کے فرمان کے عین مطابق اُسے خیر کثیر عطا کیا گیا۔ اب بھلا وہ شخص کیسے غلط فیصلہ سازی میں ملوث ہو سکتا ہے جسے رب رحمان حکمت عطا فرمادے، وہ شخص کیسے نفرتوں، عداوتوں اور کدورتوں کو پروان چڑھانے کا سبب بن سکتا ہے۔ جسے بھلائی مل گئی اور وہ شخص بھلا کیسے ظلم وعدوان، قتل وغارت گری اور انسانی عزت وحرمت کو پامال کر سکتا ہے جسے رب تعالیٰ اپنے بے بہا خزانوں میں سے معاملہ فہمی کا خزانہ عطا فرمادے۔ الٰہی فرمودات کی روشنی میں جنہیں ایسی نعمتیں عطا کی گئیں، اُن کی بول وچال، اندازِ گفتگو اور لوگوں سے میل وجول کا طریقہ ہی یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔

18 ۔الحج 22: 40
19 ۔البقرۃ 02: 251
20 ۔البقرۃ 2: 269

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

وہ سبھی انسانوں کو اپنے خالق کی مخلوق تصور کرتے ہیں اور کسی ایک ساتھ بھی رنگ و نسل کی بنیاد پر امتیازی سلوک روا رکھنے کو درست قرار نہیں دیتے۔ان کے نزدیک پھٹے و پرانے کپڑے پہنے ہوئے فرد کی بھی اتنی ہی تکریم ہے جتنی ایک امیر و کبیر اور صاحب ثروت شخص کو حاصل ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات تو غریب و پسے ہوئے طبقہ سے تعلق رکھنے والا فرد امراء پر فوقیت حاصل کر جاتا ہے کیونکہ اُس کے بارے میں تو بارگاہ ایزدی سے بھی پیغام آجاتا ہے کہ ایسے افراد کی آمد پر میزبان کی طرف سے ناگواری کا اظہار نہیں کیا جانا چاہے۔یہی منشاء خداوندی سورۃ "عبس" میں لکھا ہوا ملتا ہے اور یہی طرز ہائے سلوک "اسواہ رسول اللہ ﷺ" سے بھی عیاں ہوتا ہے کہ انسان کے ظاہری حلیے سے اُس کی تعظیم و تکریم میں فرق نہیں آنا چاہیے اور جب انسان تمام افرادِ معاشرہ کو یکساں اہمیت دینے لگتا ہے تو فطری طور پر اُس کے ذہن و دل سے منفی خیالات و تاثرات محو ہونے لگتے ہیں کیونکہ اُس نے ایسے راستے پر چلنے کو اختیار کر لیا ہے جس پر چلتے ہوئے انسان کسی کی عزت نفس کو مجروح نہیں کرتا۔کسی بھی دوسرے فرد کو اپنے ہاتھوں سے ناجائز تکلیف نہیں پہنچاتا، کسی کے ساتھ بُرے سلوک سے پیش نہیں آتا اور نہ ہی گالم و گلوچ کو اپنا وطیرہ بناتا ہے، نہ ہی تشدد پسندی کا رجحان پروان چڑھاتا ہے اور نہ ہی فسادات کی طرف بڑھنے والے قدموں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھنا گوارہ کرتا ہے بلکہ حتی الوسع کوشش کرتا ہے سبھی افراد معاشرہ اتحاد و اتفاق سے مل و جل کر رہیں اور سماج مجموعی طور پر باہمی یگانگت کا عملی مظاہرہ پیش کرے۔

اور یہی سب کچھ اسلام کا مطمع نظر بھی ہے اور مطلوب و مقصود بھی کہ مخلوط سماج میں بھی سب مل کر ایکدوسرے کی بھلائی کا تہیہ کریں، ایکدوسرے کے نفع و نقصان کو مقدم رکھیں، بھلائی میں پیش پیش ہوں اور برائی میں سد سکندری کا فریضہ سرانجام دیں۔ایک دوسرے کے خیالات و نظریات کے لیے وسعت قلبی پیدا کریں اور جہاں اصلاح احوال درپیش ہوں تو بھی گفتار و کردار کو بروئے کار لایا جائے، تصادم سے حتی الامکان گریز کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ اقوال کا ردّ و قبول، اقوال کے ذریعے ہی کیا جانا چاہیے اور شمشیر و سنان کو میدان کارزار کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے تاکہ اتمام حجت کے سبھی ذرائع باحسن و خوبی استعمال میں لائے جا سکیں جیسا کہ فرمان الٰہی ہے کہ

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ[21]

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اس طریقے سے بحث کرو جو سب سے اچھا ہو

فریق مخالف کی دشمنی کو دوستی، محبت اور اخوت میں تبدیل کا نسخہ کیمیاء قرآن حکیم میں کچھ انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ

وَ لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّیِّئَةُ-اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ[22]

اور اچھائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔برائی کو بھلائی کے ساتھ دور کر دو تو تمہارے اور جس شخص کے درمیان دشمنی ہو گی وہ اس وقت ایسا ہو جائے گا کہ جیسے وہ گہرا دوست ہے۔

مذکورہ بالا آیات قرآنیہ میں اخلاقی رواداری کا عملی اظہار بتلایا گیا ہے جو دلوں کو قریب لانے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

4۔ مخالف کے ساتھ بھی انصاف

عدل، توازن اور انصاف ایک ایسا پیمانہ ہے جس کا عکس پوری کائنات میں کھلی آنکھوں دیکھا جا سکتا ہے۔کوئی ایک ذرّہ کائنات نہیں جو اس بات کی غمازی کرے کہ اُسے جس مقام پر رکھا گیا ہے وہ اس کے مقام و مرتبہ کے لائق نہیں۔اَن گنت مخلوقات کی تخلیق میں بھی یہی اصول کار فرما ہے اور محور و مرکز کائنات کی ہستی اِس قاعدہ و کلیہ کی مظہر عظیم ہے کہ اُس کے وجود کا پُور پُور اِسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں توازن بھی رکھا گیا ہے، تناسب بھی موجود ہے اور اعتدال کا عنصر بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جھلکتا ہوا دیکھائی دیتا ہے کہ اس سے بڑھ کر "احسن تقویم" کی کوئی مثال نہیں دی جا سکتی۔لہٰذا یہ امر واضح تر ہو گیا کہ کائنات، فطرت اور اُس میں موجود لاتعداد مخلوقات کے ساتھ ساتھ حضرت انسان کا وجود بھی عدل کا عظیم نمونہ ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس سے جڑے ہوئے معاملات میں ظلم و زیادتی، ناانصافی، ناہمواری اور غیر عادلانہ عوامل شامل ہوں اور کارہائے حیات درست انداز میں پایہ تکمیل کو پہنچیں؟ ایسا قیاس کرنا بھی بعید از قیاس ہے۔کیونکہ جب عدل! نظام زندگی کا لازمی جزو ہے تو پھر امور زندگی کا بھی کلیدی عنصر ہونا چاہیے۔

لہٰذا جتنے اہم معمولات زندگی ہیں اتنی ہی اہمیت اُن معاملات میں عدل کو بھی دی جانی چاہیے تاکہ متعلقین کے حقوق ادا ہوتے رہیں اور ماحول میں ایک توازن بنا رہے۔لیکن مشاہدہ عام کی بات ہے کہ کوئی انسان جب کسی بھی سطح پر اختیارات کا مالک بن جاتا ہے تو اُس کے متعلقہ امور میں سب سے پہلے ناانصافی کا عنصر شامل ہونے لگتا ہے۔وہ فرائض منصبی میں غفلت برتنے لگتا ہے کیونکہ دیگر مصروفیات و ضروریات سے فرصت نہیں ملتی۔اپنے ہمنوا لوگوں سے رویہ تبدیل ہو جاتا ہے کیونکہ ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے اُس کا اٹھنا بیٹھنا ایسے لوگوں میں ہو گیا ہے جو صاحب ثروت افراد میں شمار کیے جاتے ہیں لہٰذا ایک وقت کے بعد اُس سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے لوگ میعارات پر پورا نہیں اترتے جس کے سبب کنارہ کُشی اختیار کی جاتی ہے اور کبھی کبھار انسان خود ساختہ زُعم میں مبتلا

21 ۔النحل 16: 125
22 ۔حم السجدہ41: 34

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

ہو جاتا ہے کہ جس مقام و مرتبہ کو وہ پہنچ گیا ہے وہاں تک پہنچنا کسی اور کے بس کی بات نہیں اور نہ ہی اتنی عزت و شہرت حاصل کر پانا کسی عامی کے دائرہ استطاعت میں ممکن ہے لہذا جو قوت و اقتدار حاصل ہو گیا ہے، اس کا منصبی تقاضا ہے کہ لوگوں سے میل وجول کم رکھا جائے اور بسا اوقات کسی عامی انسان سے چار ناچار سامنا ہو بھی جائے تو اپنی رعونت کے رُعب سے ہی اُسے لاجواب کر دیا جائے جبکہ منصبِ نیابت کا جو مقصدِ حقیقی ہے اُسے پس پشت ڈال دیا جاتا ہے تا کہ لوگ عدل وانصاف کی تلاش میں اس چوکھٹ کو شاہراہ عام ہی نہ بنالیں۔

اور مذکورہ بالا رویہ اور بھی زیادہ ضرر رساں بن جاتا ہے جب متعلقہ فرد کسی سطح پر قاضی کے منصب پر فائز ہو جائے یا اُسے کسی علاقے میں پنچائیت، جرگہ یا کٹھ کا سربراہ مقرر کر دیا جائے تو مظلومین کی بے بسی، لاچاری اور کم مائیگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اُن کے ارمانوں کے لاشوں کو روندتا ہوا چلا جاتا ہے اور ظالم کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ اُس کی فہم و فراست کے مطابق ایسا فیصلہ کرنا ہی فریقین کی اجتماعی بہتری کی راہ ہموار کرتا ہے اور اِسی میں سماجی اصلاح کا راز مضمر ہے۔ لہذا ہر خاص وعام کو اِسے قبول کرنا چاہیے اور داد و تحسین سے نوازنا چاہیے جبکہ حقیقت میں یہ سراسر غلط رویہ و فیصلہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی ذی شعور فرد ہو یا معاشرہ ایسے فیصلوں کی حمایت نہیں کرتا اور نہ انہیں "رول ماڈل" کے طور پر پروان چڑھاتا ہے اور یہی پہلو دین اسلام کو بھی مطلوب و مقصود ہے کہ عدل کرتے ہوئے ذاتی بغض وعناد، مخالفت و دشمنی یار نجش وعار آڑے نہیں آنا چاہیے پھر چاہے مدمقابل کیسا بھی فرد ہو اور اس کا مقدمہ اپنے ہی خاندان کے افراد کے خلاف ہی کیوں نہ پیش کیا گیا ہو، عدل وانصاف کے جو تقاضے ہیں انہیں بہر صورت پورا کیا جانا چاہیے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے کہ

وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْاؕ-اِعْدِلُوْا-هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰىۗ[23]

اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر نہ اُبھارے کہ تم انصاف نہ کرو (بلکہ) انصاف کرو، یہ پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے

مقام ہذا پر قرآن حکیم کی طرف سے واضح پیغام پہنچایا گیا ہے کہ رواداری کی اعلیٰ ترین شکل وہ ہے جو عدل کے ساتھ ہو حتیٰ کہ مخالف کے ساتھ بھی۔ اور فرمان نبوی ﷺ بھی اس حوالے سے بڑی واضح ہدیت دیتا ہے کہ

قَالَ إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الْحَدَّ وَايْمُ اللهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بْنَةَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا[24]

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا! پچھلی بہت سی امتیں اس لیے ہلاک ہو گئیں کہ جب ان کا کوئی شریف آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور اگر کوئی کمزور چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے اور اللہ کی قسم! اگر فاطمہ (رضی اللہ عنہ) بنت محمد ﷺ بھی چوری کرے تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ ڈالوں۔

اس سے بڑھ کر عدل وانصاف کے قیام کی اہمیت اور کیا بیان ہو گی کہ امام الانبیاء ﷺ نے سماجی سطح پر عدل کو لاگو کرنے کے لیے اپنی لختِ جگر کو بھی کسی طرح کی رورعایت نہیں دی اور شرعی تقاضوں کو بلا حیل وحجت پورا کرنے کا اعاہ فرمایا۔

قرآنی اصولِ بین المذاہب ہم آہنگی

ہم آہنگی کے عربی مترادف توافق وتطابق عمومی طور پر مستعمل ہیں جن میں مطابقت، ربط، ہم خیال یا ایکدوسرے سے موافقت رکھنے کے معنیٰ شامل ہیں۔ مذکورہ الفاظ سے جو جہت عیاں ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ بظاہر متفرق پیش منظر ہونے کے باوصف پسِ منظر سبھی کا یکساں ہے کہ موافقت و مطابقت ہی دو افراد، دو سماج یا دو مسالک و مذاہب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا سبب بن سکتے ہیں، دوسری جہت یہ واضح ہوتی ہے کہ ہم آہنگی بھی دو طرفہ اختیار کردہ رویّوں کا نام ہے کہ اس میں بھی دو فریق ہی شامل حال ہوتے ہیں جن کے رویّے، مراسم اور تعلقات ہی طے کرتے ہیں کہ ان میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے یا حقیقت حال اس کے برعکس مناظر کی عکاسی کرتی ہے۔ ممکنات میں سے ہے کہ کبھی کبھار قولی لحاظ سے ہم آہنگی کا پیدا ہو جانا ممکن ہو کہ جیسے کسی فرد کی بات سے اتفاق کر لینا یا خود قائل ہو جانا کہ خود کے اختیار کردہ مؤقف سے دوسرے فریق کا مؤقف بہتر ہے لیکن عملی لحاظ سے ذاتی عناد، حسد، انا یا کچھ اور رکاوٹیں موجود ہو سکتی ہیں جو عملی اقدامات اٹھانے سے گریزاں ہوں اور کبھی معاملہ اس کے اُلٹ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ سکوتی لحاظ سے یا اشارۃً ظاہر کر دیا جائے کہ فریق مخالف کے مؤقف کی خاموش تائید کی جاتی ہے لیکن قولی یا تحریری لحاظ سے ثبوت یا شواہد فراہم کرنا ممکن نہ ہو کہ اس سے تفرقہ بازی کے سبب خود کی جان کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

مختلف خدشات وواہمات کے زیر اثر متفرق و متوقع نتائج کا اظہار کیا جانا کثیر القومی معاشروں میں عین قرین قیاس ہے کہ حالات وواقعات کبھی بھی مخالف سمت کا رُخ کر سکتے ہیں کہ برس ہا برس کی تگ ودو کو ایک آدھ غیر متوقع واقعہ پورے منظر کا لہولہان کر جاتا ہے اور موافقت و مطابقت کے لیے کی جانے والی سر توڑ کوششیں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ لہذا جہاں ایک طرف اس پہلو کو زیر بحث

23 ۔المآئدہ 05: 08
24 ۔صحیح بخاری ج4،ص175، رقم الحدیث 3475۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

لایاجاناضروری ہے کہ بین المذاہب ہم آہنگی کی قرآنی اصول وضوابط کیاہیں ؟ اور اُن پر کیسے عمل پیراہواجائے تواس کے ساتھ دوسرے پہلو کو بھی شامل بحث کیاجاناچاہیے کہ وہ کون کونسے عوامل ہیں جو اس ہم آہنگی کو تہس نہس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تاکہ اُن کے تدارک کے لیے آغاز سے ہی لائحہ عمل مرتب کرلیاجائے۔

اسی بحث کاایک اور پہلو بھی قابل غور وفکر ہے کہ جہاں ہم آہنگی پیداکرنااور پھر اس کو قائم رکھنا ازحد ضروری ہے تواس کے ساتھ ہی اس بات کو بھی مدنظر رکھاجاناچاہیے کہ ہم آہنگی میں دویادو سے زیادہ فریق ہوتے ہیں اور اُن کے کچھ انفرادی مفادات اور کچھ اجتماعی مفادات اس سے منسلک ہوتے ہیں لہذا جب بھی تخریب کاری کاکوئی بھی واقعہ رونماہوگاتو سب سے پہلے باہمی اتفاق کو یقینی بنایاجائے گاتاکہ مشترکہ طور پر کاوشوں کابروئے کارلاتے ہوئے فسادا تی عناصر کاقلع قمع کیاجاسکے اور اس کے لیے کسی بھی فریق کی طرف داری نہیں کی جائے گی جبکہ حقیقت حال اس بات کی غمازی کرتی نظر آتی ہیں کہ اگر تخریب کار مخالف جماعت یاگروہ سے تعلق رکھتاہے تو پھر حدود سے تجاوز کردہ سزائیں بھی نافذ کی جائیں گی اور اُسے قرار واقعی سزادلوانے کی اجتماعی کوششیں کی جائیں گی کہ کسی صورت میں مجرم کو سزا سے بچنا نہیں چاہیے اور اِسے دوسروں کے لیے ضرب المثل بنادیاجائے اور جیسے خود کی جماعت یاگروہ سے تعلق رکھنے والا کوئی فرد کئی بھیانک جرائم کامرتکب ہوا، ثبوتوں اور گواہان کی موجودگی میں بھی اسُے معصوم عن الخطا قرار دیاجائے اور پھر مسلکی، مذہبی یاقانونی موشگافیوں کاسہارالے کر اُسے بری کروالیاجائے توہم آہنگی کاپیداہوناپھر دیوانے کاایساخواب ہی گرداناجاسکتاہے جو کبھی بھی حقیقت کاروپ نہیں دھار سکتاکیونکہ بین المذاہب ہم آہنگی، قرآن حکیم کی عالمگیر تعلیمات کا حصہ ہے۔ قرآن اہلِ ایمان کو دعوت دیتاہے کہ وہ مختلف ادیان کے ساتھ انصاف، احترام اور مکالمے پر مبنی تعلقات قائم کریں۔

1۔تمام انبیاءووحی کی تصدیق

قیاس کیاجاسکتاہے کہ سبھی فریقین کے نزدیک بین المذہب ہم آہنگی، رواداری اور امن کی فضا کو فروغ دینا ایک اہم وبنیادی فریضہ سمجھا جاتا ہے تاکہ ایک ہی سماج میں رہنے والے مختلف مکاتب فکر یکجہتی کا عملی مظاہرہ کرسکیں اور اتحاد واتفاق کاماحول پنپنے لگے جس کے لیے کلیدی کردار ایسی اقدار کاہوسکتاہے جو سبھی مکاتب فکر کے لیے یکساں طور پر قابل قبول بھی اور قابل عمل بھی۔ جس میں اولین فوقیت ہر مکتبہ فکر یامسلک کے دینی تشخص رکھنے والی ہستی کو دی جاسکتی ہے کہ جس کےگرد عقیدت ومحبت سے جڑے احساسات وجذبات محورقص ہوتے ہیں، اس جماعت سے تعلق رکھنے والا ہر فرد ہر طرح کی قربانی وایثار کرنے کے لیے تیار ہوسکتاہے لیکن اپنے رہبر ورہنماء کے خلاف کسی بھی دوسرے فرد کی زبان کی ہلکی سی جنبش بھی گوارہ نہیں کرتا۔

لہذا یہ ایسامقام ہوتاہے جہاں جذبات واحساسات منسلک ہوتے ہیں اور جنہیں بھڑکانے سے فسادات کاایسادرواہوتاہے جسے بند کرنا پھر کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی اور اگر کہیں امن کے قیام کی بات چل بھی پڑے تو نامعلوم کہ اس وقت تک کتنی جانیں ہلاک ہوچکی ہوں، قتل گاہ کی نذر ہوچکی ہوں، کتنے گھر اجڑ چکے ہوں اور کتنے گھرانے اپنے سربراہوں سے محروم ہوچکے ہوں؟ نامعلوم کہ اٹھنے والے فسادات کیاکیاگُل کھلاتے چلے جائیں اور کیسی ہلاکت وتباہی کاسامان نئی نسلوں کے دامن میں انڈیلتے چلے جائیں۔ یہ سب صرف ایک ہی پہلو سے جڑاہوامعاملہ ہے جس کے حوالے سے برتی گئی کوتاہی صدیوں پر محیط صدمات سے نسلوں کو دوچار رکھتی ہے لہذا اگر بین المذاہب رواداری، امن اور ہم آہنگی کو پروان چڑھاناہے تو سب سے پہلے مشترک اقدار کاتعین کرناہوگااور پھر انہی مشترک اقدار کی روشنی میں مستقبل کالائحہ عمل مرتب کرکے بہتر حکمت عملیوں کو بروئے کارلایاجاسکتاہے جس کے لیے آغاز تمام انبیاء کرامؑ کی یکساں نوعیت کی تصدیق سے کیاجاسکتاہے کہ از حضرت آدمؑ تاآنحضور اکرم ﷺ، سبھی کو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ وچنیدہ بندے شمار کیاجائے، کسی کو کسی پر ذاتی پسند وناپسند کی بنیاد پر ترجیح نہ دی جائے بلکہ تعلیمات الٰہیہ کی روشنی میں جو مقام ومرتبہ بیان فرمادیا گیاہے وہی اُن ے لیے مختص تصور کیاجائے اور اُسی کو مدّ نظر رکھتے ہوئے دوسرے فریق کی مذہبی شخصیات کی تعظیم وتکریم کی جائے تاکہ کسی بھی گروہ، جماعت یامسلک کی اجتماعی یاانفرادی طور پر دل آزاری نہ ہونے پائے جس کے لیے سب سے بہترین طرزِ عمل دین اسلام نے بیان فرمایاہے جیساکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰى وَ عِیْسٰى وَ مَاۤ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْۚ-لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ٘-وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ[25]

(اے مسلمانو!) تم کہو: ہم اللہ پر اور جو ہماری طرف نازل کیا گیاہے اس پر ایمان لائے اور اس پر جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف نازل کیاگیااور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو باقی انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے عطا کیا گیا۔ ہم ایمان لانے میں ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے حضور گردن رکھے ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت مبارکہ تمام مذاہب کی اصل وحدت اور انبیاء کرامؑ کے درمیان مساوات کا برملااعلان کرتی ہے کہ عام انسان کے دائرہ اختیار میں نہیں کہ وہ ذاتی طور پر طے کرے کہ کس نبی کریمؑ کامقام ومرتبہ کس سے کم ہے یاکس سے برتر ہے۔ یہ حق انتخاب بزرگ وبرتر ہستی رب تعالیٰ کی شان ہی کے لائق ہے کہ اُس نے جسے جس پر فضیلت عطا فرمادی متبعین کے لیے "سمعناواطعنا" کا عملی اظہار لازم ہوجاتاہے جیساکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

25 -البقرة 2: 136

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ-مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ [26]

یہ رسول (علیہم السلام) ہیں ہم نے ان میں ایک کو دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی، ان میں کسی سے اللہ نے کلام فرمایا اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں بلندی عطا فرمائی

لہذا یہ واضح ہو گیا ہے کہ تکریم و تعظیم انبیاء کرامؑ اوّلین وبنیادی عنصر ہے جو بین المذاہب رواداری، امن اور ہم آہنگی کی فضا کو قائم کرنے میں کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے اور پر عمل پیرا ہوئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں۔

2 ۔ایمان ونیکی کی مشترکہ بنیاد

تخلیق آدمؑ سے اس قصے کا آغاز کیا جائے تو واضح ہوتا جائے گا کہ ایک طرف خالق ومالک نے فطری طور پر ہر انسان کو پیدائش سے قبل بھی کہا جاسکتا ہے لیکن بعد از پیدائش تو یقینی صورت اختیار کر جاتا ہے کہ اچھائی وبرائی کا بنیادی فرق اُسے الہام کیا گیا ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے کہ

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا [27]

پھر اس کی بدکاری اور اس کی پرہیز گاری دل میں ڈالی۔

لہذا یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ انسان اگر فطری طور پر الہام کیے گیے اصولوں کے مطابق بھی زندگی گزارے تو اسے اپنے نفع ونقصان، اچھے وبُرے اور بھلائی یا برائی کے بارے میں زیادہ ابہام میں مبتلا ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور وہ آسانی کے ساتھ فیصلہ کر پائے گا کہ کس وقت کیا فیصلہ کرنا چاہیے؟ جس کی بنیاد پر تمام معاملات زندگی آسانی سے سرانجام دیے جاسکتے ہیں لیکن

اسی موضوع کا دوسرا پہلو بھی ساتھ ساتھ ہی ماضی کا حصہ بنتا گیا کہ جیسے جیسے انسانوں کی آبادیاں بڑھتی گئیں، ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، ضروریات وخواہشات اور ذمہ داریوں کا دائرہ کار بھی بڑھتا گیا۔ اگر ایک انسان کھیتی باڑی میں مشغول ہو گیا تو اس کے لیے مشکل ہو گیا کہ وہ بڑھئی کا کام بھی کرے۔ اگر ایک فرد راج گیری میں مہارت حاصل کر کے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگا تو اس کے لیے مشکل تر ہوتا چا گیا کہ وہ اپنی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ درزی کا شعبہ بھی اختیار کر لے اور اسی طرح جو طب کے شعبے میں مہارت تامہ حاصل کر گیا اُس کے لیے دشوار ہو گیا کہ حفاظتی امور پر مشتمل معاملات کو نبھانے کے لیے سرحدوں پر نگرانی کے فرائض سرانجام دے کیونکہ جس نے جس میدان میں مہارت حاصل کی وہی کام باقی ماندہ زندگی میں اُس کے لیے آسان تر ہوتا چلا گیا اور سماجی ومعاشرتی ذمہ داریوں کا تعین بھی اسی طرز پر طے کیا جاتا ہے کہ ہر کوئی اپنی پر عائد ذمہ داریوں کا احسن انداز میں پورا کرے گا تاکہ دوسرے کے حقوق ادا ہوتے رہیں اور معاشرہ یکجہتی کا عملی اظہار بن سکے۔

لہذا ایک طرف قدرت کی طرف سے عطا کردہ شعور جس کے سبب انسان اچھے وبُرے کے فیصلے کرتا اور دوسری طرف سماجی زندگی میں عائد ذمہ داریوں کی ادائیگی، یہ دونوں عوامل مل کر متعین کرتے گئے کہ کس فرد نے کس کام کو کس انداز سے کرنا ہے؟ کیوں کرنا ہے؟ کس لیے کرنا ہے اور؟ کب تک کرنا ہے؟ کس انداز سے کرنا ہے اور کس انداز سے نہیں کرنا ہے؟ کن اصولوں کی پاسداری کرنی ہے اور کِن ضوابط کے خلاف ورزی نہیں کی جانی چاہیے کہ ایسا طرزِ عمل ملحقہ افراد کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت کا سبب بنے گا جس سے اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے۔ لہذا صاحب الرائے افراد کی طرف سے مجوزہ تجاویز کی روشنی میں مرتب کئے گیے ضوابط کی پابندی لازمی امر ہے تاکہ اجتماعی مفادات کا تحفظ یقینی بنایا جاسکے اور سبھی افراد معاشرہ ایک دوسرے کے لیے مفید کارندے ثابت ہو سکیں اور سماجی وجود کو استحکام بخشنے کے لیے اپنا اپنا کردار ادا کر سکیں۔

اسی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے انسان کے خالق ومالک نے اس کی فطرت میں موجود خامیوں کے سبب ایک ایسے سلسلے کا انتظام بھی فرمایا کہ جس کے ذریعے وقتاً فوقتاً اُسے جدید خیالات وافکار سے آگاہ کیا جاتا رہے راہ راست کی طرف لوٹنے کے لیے درست عوامل کی نشاندہی کی جاتی رہے تاکہ جب بھی اُسے ضرورت پیش آئے، اُن سے رہنمائی حاصل کر کے خود کا قبلہ درست کر لے۔ جسے "سلسلہ وحی" کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرامؑ کی صورت میں الٰہی ہدایات کا سلسلہ جاری فرمایا کیونکہ انسان بہر حال خطا کا پتلا ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں جا کر غلطی کرے گا، اُسے پچھتاوا ہو گا، احساسِ ندامت بیدار ہو گا، واپس لوٹنے کی راہ تلاش کرے گا، کسی تسلی وتشفی کا منتظر رہے گا جو اُسے گناہ یا غلطی ہونے کی صورت میں امید دلائے کہ ابھی بہت کچھ نہیں بگڑا۔ اصلاح ممکن ہے۔ رجوع کا راستہ کھلا ہے۔ غلطی کا اعتراف کر کے معافی وتلافی کی جاسکتی ہے۔ ازالہ کرنا ممکن ہے، تعلقات کو پہلے کی طرح بحال کیا جاسکتا ہے۔ امید کی ایک کرن ابھی بھی چمک رہے ہے لہذا مایوس ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بس رجوع کرنے اور توبۃ النصوح کرنے کی دیر ہے، سارے کا سارا معاملہ دوبارہ سے شروع ہو جائے گا۔ تعلق بحال ہو جائے گا اور طبیعت پہلے کی طرح ہشاش بشاش ہو جائے گی۔

26 - البقرة 02: 253
27 -الشمس 91: 07

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

اور یہ سب کچھ اسی لیے ضروری تھا تا کہ انسان جہاں سے آیا ہے وہاں سے جڑا رہے کیونکہ بلآخر اس نے لوٹ کر وہی جانا ہے تو جب آخری منزل وہی ہے جہاں سے آغاز ہوا ہے تو اُس مقام سے منسلک رہنا ہی انسان کے لیے زیادہ فائدہ مند ثابت ہو گا۔ لہذا فطری طور پر عطا کیا گیا شعور، سماجی ذمہ داریاں اور سلسلہ وحی یہ اک ایسی مثلث ہے جس کے بغیر کوئی بھی انسان کامل طور پر درست رہنمائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اِن تینوں عوامل کا باہمی تعلق بنے گا تو ہی درست راستہ واضح ہو گا اور تبھی انسان خود کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے مفید و کارآمد بنے کی صلاحیت حاصل کر سکتا ہے ورنہ بصورت دیگر زندگی بیکار است۔

مذکورہ بالا تعلق کی ضرورت ازل سے رہی ہے اور معاشرے اسی تعلق کے مضبوط و کمزور ہونے کی وجہ سے ہی عروج وزوال سے ہمکنار ہوتے آئے ہیں اور آج بھی نسخہ کیمیا یہی ہے کہ جس سماج میں قدرتی طور پر عطا کردہ شعور کے ساتھ سلسلہ وحی کے ذریعے دی گئی ہدایات کو مشعل راہ بنا لیا جاتا ہے وہی معاشرہ اوجِ ثریا کی بلندیوں کو چھو پاتا ہے اور یہی تسلسل ہر دور میں ہر سماج کی بنیادی ضرورت رہا ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ فطری طور پر نیکی، بھلائی اور اچھائی کا معیار یکساں نوعیت کا ہو گا جو سبھی انسانوں کے لیے قابل قبول بھی ہوتا ہے اور قابل عمل بھی۔ جب بھی کوئی انسان اُس ڈگر سے ہٹ کر چلے گا تو ہر فرد پہچان لے گا کہ فلان بن فلاں غلط راستے پر چل رہا ہے اور فلاں غلطی کر رہا ہے جس سے بچنے کی تلقین کی جانی چاہیے یا اُسے حسبِ استطاعت روکنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

یہی اجتماعی شعور ہے جسے قرآن حکیم متعدد مقامات پر اور مختلف انداز سے جھنجھوڑتا ہے کہ اے انساں! ذرا فلاں بات پر تو غور کر کیا ایسا نہیں ہے؟ کیا اُس کو بنانے والا ایک ہی رب نہیں ہے؟ کیا اُسے ترتیب و تنظیم دینے والی فلاں ذات نہیں ہے؟ ان گنت سوالات قران مجید میں انسان کو مخاطب کر کے پوچھے گیے ہیں کہ اگر کوئی غور و فکر کرنے والا ہے تو اُن کے جوابات دے لیکن انسان ہے کہ اُن تمام سوالات سے صرف نظر ہی کر رہا ہے اور تبھی پریشان حال رہتا ہے۔ لہذا پیش نظر موضوع کے حوالے سے بھی قرآن حکیم ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ امن ،رواداری اور ہم آہنگی کا نظام قائم کرنے کے لیے اُسی کی بتلائی گئی ہدایات پر عمل پیرا ہونا ہو گا تبھی دنیا میں پریشانیوں سے نجات کا راستہ نکل سکتا ہے لہذا ایمان و نیکی کی مشترکہ بنیاد کو مد نظر رکھتے ہوئے فرمان الٰہی پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے جیسا کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـُٔوْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ[28]

بیشک ایمان والوں نیز یہودیوں اور عیسائیوں اور ستاروں کی پوجا کرنے والوں میں سے جو بھی سچے دل سے اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئیں اور نیک کام کریں تو ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس آیت مبارکہ میں تقویٰ اور نیک عمل کو مذہب سے بالاتر عالمگیر قدر قرار دیا گیا ہے تا کہ لوگوں کے ذہنوں پر دستک دی جا سکے کہ جس رب العالمین کے حضور حاضر ہونا ہے وہ سبھی سے اُن کے اعمال کے مطابق حساب لے گا اور جزا سے نوازے گا لہذا یہ عالمی قدر ہے جس پر سبھی کو غور و فکر کرنا چاہیے۔

3۔ مشترک اقدار کی بنیاد پر مکالمہ سازی

سماج! روایات، اقدار اور فکری افتراق کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ اس میں بسنے والے لوگ مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کے سبب اُن کی مقامی و معاشرتی روایات، انفرادیت کی متحمل ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی اہمیت کی حامل بھی ہوتی ہیں، اسی طرح جب مختلف خاندان ایک علاقے میں مل و جل کر رہنے لگتے ہیں تو اُن کی آپس میں روایات کا ملاپ ہوتا ہے جہاں سے کچھ روایات کو ترک کر دیا جاتا ہے، کچھ کو اپنا لیا جاتا ہے اور کچھ میں ترامیم کر لی جاتی ہیں تا کہ جہاں دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر رہا جا رہا ہے وہاں امن وامان کا ماحول قائم کیا جا سکے۔ اسی طرز پر پرانی و نئی قدار کی ریت بھی پروان چڑھنے لگتی ہے جس میں ترامیم واضافہ جات بوقت ضرورت رونما ہونا ایک فطری اصول ہے۔

جب انسانوں کی باہمی روایات آپس میں ملتی ہیں تو تغیر و تبدل ایک آفاقی قاعدہ کے مطابق رونما ہوتا ہے اور اسی طرز پر اقدار کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ تو جہاں ایک طرف اہم تغیرات برپا ہو رہے ہوں تو فکری ٹکراؤ اور تغیر کا نہ ہونا بعید از قیاس ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ سماجی و معاشرتی سطح پر لوگوں کی خاندانی روایات واقدار میں تبدیلیاں ہوتی چلی جائیں لیکن فطری سطح پر جمود طاری ہو۔ لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہاں لوگوں کے افکار میں بھی یقیناً تبدیلی پیدا ہوئی ہو گی اور ایسا ہونا غیر فطری واقعہ نہ ہو گا۔

لہذا مذکورہ بالا بحث سے واضح ہوا کہ روایات، اقدار اور فکری تغیر پیدا ہونا ایک اصولی تقاضا ہے اور جب یہ تبدیلیاں رونما ہوئی ہوں گی تو متعلقہ افراد نے کہیں پر اپنی اناؤں کی بھینٹ چڑھائی ہو گی اور کہیں پر اپنی بات کو منوایا ہو گا تبھی جا کر سماجی سطح پر ایکدوسرے کے لیے خلا بنا ہو گا تا کہ سبھی اس میں سما سکیں اور ایک دوسرے کے لیے سہولت پیدا کر سکیں۔

---

28 البقرۃ 02 : 62

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

بعینہ مذہبی نقطہ نظر کو بھی اسی پہلو سے زیر بحث لایا جاسکتا ہے تاکہ یہاں بھی گنجائش نکالی جاسکے کہ اگر مذہب ایک نہیں ہے، مسلک ایک نہیں ہے، ثقافت ایک نہیں ہے، رہن وسہن ایک جیسا نہیں ہے، بول وچال آپس میں نہیں ملتی، رنگ وروپ میں یکسانیت نہیں حتیٰ کہ فکر ایک جیسی نہیں تو پھر کیا ضوابط ہونے چاہیے تاکہ اتنے کثیر اختلافات ہونے کے باوجود بھی لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکیں۔ ایک سماج کا حصہ بن سکیں۔ معاشرتی زندگی کو احسن انداز میں گزارنے کا لائحہ عمل مرتب کر سکیں تاکہ سبھی کے لیے گنجائش پیدا ہو جائے۔ ایک دوسرے کی رنگت کو میعار نہ بنایا جائے۔ ایک دوسرے کے مذہب ومسلک کو فرقہ واریت کا سبب قرار نہ دیا جائے، ایک دوسرے کی ثقافت کو روایات کو فریق مخالف کے لیے وبال جان نہ بنایا جائے۔ اگر اپنی روایات کو دل وجان سے قبول کر لیا گیا ہے تو اُن اقدار کو، افکار کو ہمسائیگی میں رہنے والے خاندان یا افراد پر تھوپنے کی حتی الوسع کوشش نہ کی جائے تاکہ وہ اپنی زندگی کے بارے میں متضاد خدشات کا شکار نہ ہو جائیں۔

اس لیے اگر ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا مطلوب ومقصود ہو تو لامحالہ کچھ اصول وضوابط ایسے متعین کرنے ہوں گے جو سب کے لیے یکساں اہمیت کے حامل ہوں، سبھی افراد معاشرہ پر ایک جیسے نافذ ہوں، کسی سے قوم وملک، مسلک ومذہب، رنگ ونسل کی بنیاد پر رعایت نہ برتی جائے اور نہ ہی کوئی مطالبہ کر سکے۔ قانون سب کے لیے ایک جیسا سلوک رکھے، جزا وسزا کا یکساں نظام ہو اور کوئی بھی کسی دوسرے کی ذاتی زندگی کو اجیرن نہ بنائے بلکہ اس کی آزادی کا احترام کرے اور جس طرح خود کے افکار وخیالات کو مقدم مؤقر جانا جاتا ہے بعینہ دوسرے تمام متعلقین کو بھی وہی اہمیت دی جائے جس کے لیے خصوصی طور پر مذہبی نقطہ نظر کو باقی ماندہ تمام پہلوؤں پر فوقیت دی جانی چاہیے کیونکہ یہ ایک ایسا پہلو ہوتا ہے جو بہت حساس اور سنجیدہ نوعیت کا ہوتا ہے جس پر متنازع گفتگو ورد عمل انتہائی بھیانک نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔

لہذا جہاں دیگر قواعد وضوابط کے حوالے سے خوب غور وفکر کیا جائے وہیں اس پہلو کو بھی مد نظر رکھا جانا چاہیے تاکہ سماج کے اجتماعی مفادات کا تحفظ یقینی بنایا جاسکے اور امن، رواداری اور باہمی ہم آہنگی کے راستوں کو کشادہ کیا جاسکے جس کے لیے وقتاً فوقتاً مکالمہ بازی کا انتظام کیا جانا انتہائی ناگزیر امر ہے کہ جب تک آپس میں گفتگو نہیں کی جائے گی۔ دوسرے کی فکر میں، دوسروں کے خیالات میں جگہ بنانا ممکن نہیں، انہیں اپنا موقف بتانا اور ان کا مؤقف سننا مکالمہ کے بغیر ممکن دیکھائی نہیں دیتا کیونکہ یہی ایک راستہ ہے جس پر چل کر اس منزل تک پہنچا جاسکتا ہے جہاں امن، رواداری اور ہم آہنگی کے پھول کھلتے ہیں اور دوسروں کو بھی اتنا ہی معزز ومحترم گردانا جاتا ہے جتنا کی خود کی ذات کو یا اپنے سے متعلق افراد کو اہمیت دی جاتی ہے لہذا مکالمہ کے حوالے سے فرمان الٰہی ہے کہ

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ [29]

اے حبیب(ﷺ)! آپ فرمادیں، اے اہلِ کتاب! ایسے کلمہ کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں کوئی ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کو رب نہ بنائے

مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں بین المذاہب مکالمے کا قرآنی منشور بیان کیا گیا ہے جو اشتراک پر مبنی ہے، تصادم پر نہیں لہذا سبھی مکاتب فکر کو اِسے پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

4۔ مذہبی خود مختاری کا احترام

کرہ ارض پر نزولِ حضرت آدمؑ کے ساتھ ہی دو متضاد مگر باہم مربوط راستے ازل سے ہی ساتھ چلے آرہے ہیں۔ ایک حق کا راستہ جس پر چلنے والوں کے لیے مشکلات اور آزمائشوں کا وسیع ذخیرہ موجود ہے مگر اختتام ہمیشہ ازلی کامیابی کی صورت میں ہی اُن کے سامنے آیا ہے اور آتا رہے گا اور انہی کو کامیاب افراد شمار کیا گیا ہے جن کے لیے دنیوی زندگی میں بقدر استطاعت مختلف امتحانات تیار کیے گیے جن سے باتوفیق باری تعالیٰ بالآخر سرخرو ہوئے اور دوسرا راستہ باطل کا رستہ ہے جسے مختلف آسائشوں سے مزین کیا گیا ہے، دیکھنے والوں کو بظاہر بڑا پُرکشش نظر آتا ہے اور آغاز میں سبھی کچھ درست نظر آتا ہے اور کوئی ایسی رکاوٹ بھی درپیش نہیں ہوتی جس سے انسان سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ آیا اس راستے پر چلنا بھی چاہیے یا نہیں لیکن تنبیہات کی صورت میں اس راستے کے بارے میں وقتاً فوقتاً رب تعالیٰ سبحانہ کی جناب سے مقربین کو بھیجا گیا ہے تاکہ بھٹکے ہوئے لوگوں کو دوبارہ راہِ راست پر لایا جاسکے اور یہ قصہ کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار مقدس ہستیوں جنہیں پیغمبرؑ کہا جاتا ہے پر مشتمل ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ خالق ومالک دوجہاں نے اتمام حجت کے لیے کوئی قصر اٹھائے نہیں رکھی کہ جس کی وجہ سے کوئی بھی انسان عذر تراش سکے کہ اس کے پاس پیغام الٰہی پہنچانے والا پیغمبر نہیں آیا یا اس کے مصاحبین نے پیغام نہیں پہنچایا۔

یہ عذر ناقابل قبول گردانا جاتا ہے کیونکہ عصر حاضر کے شواہد سے عیاں ہو جاتا ہے کہ واحدانیت کوئی ڈھکا وچھپا معاملہ نہیں بلکہ کائنات کے ذرے ذرے کا بنیادی جزو ہے جو اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اس کا خالق کون ہے؟ اور کس مقصد کے لیے تخلیق کیا گیا ہے اور مؤحدین دنیا کے کونے کونے پر جاکر پیغام الٰہی کو پہنچا رہے تاکہ دین اسلام کا پیغام سبھی تک پہنچ جائے اور بلاشبہ اس میں مبلغین کی کاوشوں کو سراہا جانا چاہیے۔

29 ۔آل عمران 03: 64

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

موضوع بحث کی طرف لوٹا جائے تو جب حق و باطل کا راستہ واضح کر دیا گیا ہے اور اتمام حجت کے تمام وسائل کو بروئے کار لایا جا رہا ہے تو عصری مسائل کا تدارک کیسے ممکن ہے کہ جہاں ہر فرد عملی طور پر برسرِ پیکار ہے کہ سبھی مذاہب کو یکساں اہمیت دی جانی چاہیے اور تمام افراد معاشرہ خود مختار ہیں کہ وہ جس مذہب کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہیں کریں اور جسے رد کرنا چاہیں اُسے رّد کر سکیں اور اس سارے عمل کے دوران جنونی افراد کی جانب سے متعلقہ افراد کو کسی قسم کا بھی خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی یہ کسی کا استحقاق ہے وہ کسی بھی دوسرے فرد کو خوف زدہ کرے۔

لہٰذا یہ پہلو کھل کر واضح ہو جاتا ہے کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے لہٰذا ہر فرد اپنی فکر و مذہبی روایات کا خود امین و ضامن ہے کہ وہ کس طرح اُن پر عمل پیرا ہوتا ہے اور کن عوامل کو وہ ترک کر دیتا ہے اور اس کے لیے حکومتی سطح پر قوانین کو بھی نافذ کیا جاتا ہے اور سزاؤں کا تعین بھی کیا جاتا ہے تاکہ افراد کے جان و مال کے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکے اور معاشرے میں مخلوط ماحول پروان چڑھے جس کے سبب امن و رواداری کو فروغ دیا جا سکے۔

مذکورہ بالا بحث سے واضح ہو گیا ہے کہ سماجی سطح پر بھی یہ سوچ پنپ چکی ہے کہ اپنا مذہب یا مذہبی فکر کسی دوسرے فریق پر زبردستی تھوپی نہیں جا سکتی اور نہ ہی تھوپنے کی کوئی بھی فکری یا عملی کاوش برائے کار لانی چاہیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ کیا یہ فکر پہلی دفعہ منصہ شہود پر آئی ہے یا اس کے حوالے سے تاریخ میں بھی کچھ شواہد ملتے ہیں کہ ہر طرح کی کد و کاوش کو بروئے کار لانے کے بعد جب صورتِ حال تبدیل نہ ہو رہی ہو تو کیا لائحہ عمل مرتب کیا جائے کہ اپنی جان بھی محفوظ رہے اور دوسروں کو بھی واضح پیغام پہنچ جائے کہ اگر حق کا راستہ چننا ہر فرد کا اختیاری معاملہ ہے تو پھر فریق مخالف کو بھی یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ حق کے راستے پر چلنے والوں کے لیے کانٹے بچھائے اور اُن کا جینا محال کر دے لہٰذا جب ایسی صورت حال درپیش ہو تو مؤحیدین کی جانب سے واضح پیغام دے دیا جانا چاہیے کہ ہم اپنے راستے سے ہٹیں گے نہیں مگر دوسروں کو بھی اختیار نہیں دیں گے وہ ہمیں مجبور کریں کہ اختیار کردہ راستے کو چھوڑ کر اُن کے ہمنوا بن جائیں لہٰذا پھر ایک ہی راستہ باقی بچتا ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم میں بڑا واضح انداز میں بیان فرمایا ہے کہ

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ [30]

تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔

ادیان و مذاہب عالم کے لیے قرآن حکیم کی طرف سے باہمی احترام اور آزادیِ عقیدہ کا جامع اعلان فرمایا گیا ہے کہ اتمام حجت کے باوجود بھی کوئی دین اسلام کو قبول کرنے کے لیے رضامند نہیں تو سبھی اپنے اپنے عقائد کے مطابق عمل پیرا رہیں لیکن دوسرے کے جذبات و حساسات کو ٹھیس نہ پہنچائی جائے اور سبھی کو یکساں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

5۔ غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک

عقل انسانی نے جب جب وحی الٰہی، کتب الٰہیہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کے بتلائے و سکھائے ہوئے طریقوں سے روگردانی کی ہے تب تب پُر خار وادیوں میں بھٹکی ہے اور ہمیشہ ہی گھاٹے کا سودا کیا ہے۔ پھر ایک در چھوڑ کر در در بھٹکی ہے۔ کبھی طوفانوں و آندھیوں سے خوفزدہ ہو کر انہیں معبود مان لیا، کبھی قدرتی نظائر کی ہیبت و ہیبت سے متاثر ہو کر اُن کے سامنے سجدہ ریز ہوئی اور کبھی انسانی ہاتھوں کے بنے ہوئے بتوں کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہے لیکن اس کے سامنے عجز و انکساری سے پہلو تہی کی ہے جو اس کا حقیقی خالق و مالک ہے اور جس کی ذات ہی لائق عبادت و تحسین ہے۔

پھر اِسی بھٹکی ہوئی عقل نے سماجی سطح پر جب آپس کے معاملات میں فیصلے کرنے شروع کئے تو اصول وضع کرتی چلی گئی جن میں ایک فریق کو برتر تسلیم کر لیا جاتا اور باقی ماندہ تمام طبقات کو خادم کی حیثیت دے دی جاتی۔ تاریخی لحاظ سے وہ بادشاہوں کا دور حکومت ہو، مذہبی اجادہ داری کے ذریعے خود ساختہ ریاستی بالادستی، سرمایہ دارانہ نظام کا بول بالا ہو یا جمہوریت کی چیر دستیاں ہوں، طبقاتی تقسیم ہر دور میں اور ہر معاشرے میں نظر آتی ہے اور یہ تقسیم ہر گزرتے لمحے پہلے سے زیادہ گہری ہوتی جاتی ہے کہ بالا طبقات نے مراعات کو بنیادی حق بنا لیا اور باقی طبقات کو قسمت و نصیب کے کھاتے میں ڈال کر دلاسہ دے دیا کہ جب تقدیر میں یہی لکھا ہے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔

ایک حد تک طبقاتی تقسیم بھی ہر سماج کا لازمی جزو ہے اور ہونی بھی چاہیے کہ ذمہ داریوں کے لحاظ سے ہر فرد کو مختلف و متضاد فرائض و حقوق کو نبھانا و ادا کرنا ہے اور اسی میں معاشرے کا حسن پنہاں ہے اور یہ تقسیم ریڑھ کی ہڈی جیسی حیثیت رکھتی ہے جس کے بغیر کسی بھی سماج کے وجود کی بقا ممکن نہیں اور یہی طرز زندگی ایک فطری اصول کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے لیکن جو تقسیم زیادہ وبال جان بن جاتی ہے وہ ضروریات و سہولیات کے مساویانہ دستیابی نہ ہونے کے سبب پیدا ہونے والی تقسیم ہے کہ خوراک کی سبھی کو ضرورت ہے، ادویات سبھی کے لیے لازمی شے ہیں، مناسب رہائش کا بندوبست ہونا بھی ضروریات زندگی میں سے ہے جس پر کسی بھی زمانے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ آدھی آبادی کی مذکورہ بالا ضروریات درکار ہوتی ہیں اور باقی ماندہ کو نہیں۔

30 - الکافرون 109: 06

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

گھمبیر مسلہ ان وسائل کی دستیابی وعدم دستیابی پر پیدا ہوتا ہے کہ ایک طبقے کے لیے ہمہ وقت وسائل کی فراوانی کو سستی قیمتوں پر یقینی بنایا جاتا ہے جبکہ دوسرا طبقہ نان ونفقہ کے اخراجات کے حساب وکتاب سے ہی فرصت نہیں لے پاتا۔ بیمار ہونے کی صورت میں ایک طبقے کے لیے انہیں وسائل کے ساتھ سبھی سہولیات کامل صورت میں ہنگامی حالات میں بھی دستیاب ہوتی ہیں جبکہ دوسرا طبقہ کبھی گھر کی دہلیز پار نہیں کر پاتا، کبھی راستے میں ہی امید کھو بیٹھتا ہے اور کبھی ہسپتال کی دہلیز سے اندر قدم نہیں رکھ پاتا اور اگر وارڈ تک رسائی ممکن ہو جائے تو ڈاکٹر پر کاہ کی وقعت دینے کو تیار نہیں ہوتے، اگر وہ اپنا قیمتی وقت نکال لیں تو میعاری ادویات دستیاب نہیں اور جب تک ادویات کی دستیابی اپنی جیب سے یقینی بنائی جاتی ہے تب تک مریض راہی عدم ہو چکا ہوتا ہے اور جو بچ کر آجاتا ہے وہ دوران بیماری ملنے والی تکالیف سے بقیہ ساری زندگی نبرد آزمار ہتا ہے اور مرتے دم تک یہی التجاء کرتا رہتا ہے کہ دوبارہ کبھی اُن راہ داریوں سے نہ گزرنا پڑے حالانکہ وہ بھی انہی سہولیات کا اتنا ہی حقدار ہے جتنا کہ اول الذکر طبقہ لیکن آڑے آجاتی ہے عقل کی بنیاد کی قائم کی گئی طبقاتی تقسیم اور وہ اصول وضوابط جو اُس عقل نے طے کیے کہ سماجی زندگی کا ڈھانچہ کیسا ہونا چاہیے؟ اور زندگی کے تار وپود کن لوازمات سے مل کر بنائے جانے چاہیے جو سماجی زندگی کا جزولاینفک رہیں گے۔

یہی طبقاتی تقسیم جب سیاست میں درآتی ہے تو نتائج پہلے سے زیادہ بھیانک نکلتے ہیں کہ خون ریزی ہی پہلا انتخاب ہوتا ہے۔ یہی تقسیم جب معاشیات میں آجاتی ہے تو سرمایہ سکڑنے لگتا ہے اور دلوں میں نفرتوں وکدورتوں کے ڈیرے لگنے لگتے ہیں اور اِنہی نفرتوں کے سائے میں جب یہی تقسیم اخلاقیات میں درآئے تو اچھائی وبرائی کو ناپنے کے پیمانے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر بالا طبقہ جو کہے وہی اخلاق بن جاتا ہے اور جو کرے وہی اصول۔ پھر نفع ونقصان کسی آفاقی قانون کے تحت نہیں بلکہ ذاتی خواہشات کے گرد گردش کرتا ہے اور پھر انسانی زندگی کی قدر وقیمت کھوٹے سکے کے برابر بھی نہیں گردانی جاتی بلکہ کہا جائے تو کھوٹا سکہ کہیں نہ کہیں استعمال میں لایا جاسکتا ہے، اس کی کوئی قدر وقیمت لگ سکتی ہے لیکن انسانی جان کی حرمت ختم ہو جاتی ہے۔ اور دینِ اسلام کا بنیادی مقصد انہی خرافات کا قلع قمع کرنا ہے۔ انہیں اپنے حقیقی مقام ومرتبہ سے متعارف کروانا ہے جو رب تعالیٰ نے ازل سے مقرر فرمایا ہے اور سبھی انسانوں کو ایک چھتری تلے جمع کرنا ہے۔

کیونکہ سبھی انسان آولاد آدمؑ ہیں اور سبھی کا خالق ومالک ایک ہی ہے جس نے رنگ ونسل کو خوبصورتی کے لیے، قوم وقبیلہ کو پہچان کے لیے، سرمایہ کو آپسی معاملات میں سہولت کے لیے اور سماجی زندگی کو مل وجل کر رہنے کے لیے زندگی کا جزولاینفک بنایا تاکہ لوگ ایکدوسرے کی قدر کریں، عزت واحترام کو ملحوظ خاطر رکھیں اور جہاں بھٹکنے لگیں وہاں وحی الٰہی، کتب سماویہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت سے رہنمائی حاصل کر کے قبلہ درست کر لیں اور تاریخِ انسانی اس بات پر شاہد ہے کہ دنیا میں تبھی امن وسکون، رواداری اور باہمی ہم آہنگی کا ماحول درست سمت میں پروان چڑھا ہے جب جب لوگوں نے اپنے مسائل کا حل مذکورہ سابقہ عناصر ثلاثہ میں تلاش کیا ہے اور آج کے پُرفتن دور میں بھی امن وامان کے دیرپا قیام کے لیے وہی عناصر مفید اور قابلِ عمل حل پیش کرنے کہ بدرجہ اُتم صلاحیت وقابلیت رکھتے ہیں جس میں دین اسلام کو اوّلین فوقیت حاصل ہے۔

کیونکہ اسلام صرف مسلمانوں کے مسائل ورہنمائی کے لیے نازل نہیں فرمایا گیا بلکہ دنیا میں موجود ہر انسان ہمہ وقت اس سے رہنمائی لے سکتا ہے کیونکہ صرف یہی وہ دین ہے جس کے دامن میں ہر مکتبہ فکر کے لیے بہترین سنہری اصول ہمہ وقت رہنمائی کے لیے موجود ہیں اور جن سے استفاہ ہر قسم کے طبقاتی وسماجی نظام سے تعلق رکھنے والا فرد بلا رنگ ونسل، قوم وقبیلہ اور ملک وسلطنت کے کر سکتا ہے اور اپنے مسائل کا دیرپا حل تلاش کر سکتا ہے لیکن توقعات کے عین مطابق ایسا ہوتا زمانہ حال میں ممکن دیکھائی نہیں دیتا۔ اس کے باوجود کلمہ حق کو بلند کرنا، درست منزل کی نشان دہی کرنا اور پھر صحیح سمت کا تعین کر دینا، دین حنیف کے علمبر داروں کی اوّلین ذمہ داریوں میں شامل ہے تاکہ حجت قائم رہے۔ لہذا اسی پہلو کے پیش نظر درجہ ذیل میں قرآن حکیم کا پیغام مختصراً بیان کیا جارہا ہے تاکہ رہنمائی کے لیے سہولت پیدا ہو سکے۔ فرمان الٰہی ہے کہ

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ[31]

اللہ تمہیں ان لوگوں سے احسان کرنے اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جنہوں نے تم سے دین میں لڑائی نہیں کی اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں اہل اسلام کے لیے ایک سنہری اور عالمگیر اصول بیان فرمایا ہے کہ بین المذاہب بقائے باہمی کے سیاسی اور اخلاقی اصولوں وضوابط کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسا لائحہ مرتب کیا جائے کہ جو فریق، قوم، قبیلہ یا ملک تمہارے خلاف کسی بھی جارحیت کا مظاہرہ نہیں کرتا اس کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا جائے اور امن وامان کی صورت کو برقرار رکھنے کے لیے اقدامات بروئے کار لائے جائیں اور جو ایسے اعمال اختیار کرے گا رب سبحانہ وتعالیٰ اس سے محبت فرمائے گا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا سے بڑھ کر اور کس کی رضا ہو سکتی ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ایک مسلمان جدوجہد کرے؟

31 ۔الممتحنہ: 68: 08

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

6۔عالمگیر اخوت اور مساوات

مذہب ومسلک ہر قوم کا انفرادی معاملہ ہوتا ہے جس میں کسی بھی دوسری قوم یا قبیلہ پر فطری اصول کے مطابق جبر نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اُسے بزور طاقت وقوت دوسرے مذہب کو قبول کرنے لیے مجبور کیا جائے البتہ شریعت اسلامیہ میں اس قاعدہ کو مسلم تسلیم کیا جاتا ہے کہ اسلامی ریاستی حدود وقیود میں کسی بھی دوسرے مذہب کی تبلیغ کی اجازت نہیں ہاں! مگر جو بھی جماعت یا گروہ اُن مسلم علاقوں میں خوشدلی سے رہائش پذیر ہوگا انہیں ریاست وانتظامیہ کی طرف سے مکمل طور پر تحفظ فراہم کیا جائے گا اور انہیں اپنی اپنی عبادت گاہوں میں اُنہی کی مذہبی تعلیمات کے مطابق عباداتی معاملات کو انجام دینے کی مکمل آزادی ہوگی اور جو بھی فریق اس کی مخالفت کریگا اُسے مذہبی وقانونی سطح پر طے کردہ شقوں کا سامنا کرنا ہوگا اور تاریخ گواہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو سب سے زیادہ تحفظ اسلامی ملکوں کی حدود میں ہی فراہم کیا گیا ہے بلکہ اگر کہا جائے کہ صرف اسلامی ریاستوں نے ہی اس امر کو یقینی بنایا ہے کہ کسی غیر مسلم کی دل آزاری نہیں کی جائے گی اور اُسے مکمل مذہبی ازادی دی جائے گی تو مبالغہ نہ ہوگا۔

دوسری طرف تاریخی شواہد سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف عصری حالات کو ہی پیش نظر رکھ لیا جائے تو پوری دنیا میں غالب اقوام کی طرف سے جن اقوام پر سب سے زیادہ ظلم وستم روا رکھا جارہا ہے ان میں سرِ فہرست مسلم قوم کا آتا ہے۔ وہ قوم جس نے ماضی میں بلا تفریق رنگ ونسل، مذہب ومسلک اور قوم وقبیلہ سبھی کو مساویانہ حقوق دیے آج جب انہی پر کڑا وقت آیا ہے تو غاصب اقوام ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں اور اُن مظالم میں کسی بچے، بوڑھے اور عورتوں کی جنس کا لحاظ بھی نہیں رکھا جارہا کہ ان طبقات پر دست درازی نہیں کی جانی چاہیے جبکہ اسلام کے جنگی اصولوں میں سنہری حروف کے ساتھ جو قواعد فرمان نبوی ﷺ کے روشنی میں اوّل دن سے لازمی جزو کی حیثیت سے شامل ہیں وہ یہی ہیں کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، معذور اور جنگ میں شامل نہ ہونے والے لوگوں پر تیر یا تلوار نہیں چلائی جائے گی۔ باغات، جنگلات یا درختوں کے جھُنڈ کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا جبکہ دوسری طرف عراق، شام غزہ، یمن، کشمیر، برما ودیگر علاقوں کا سرسری سا جائزہ لینے پر بھی واضح ہوتا چلا جاتا ہے کہ ظلم وستم کرتے وقت کسی اصول وقواعد کی پاسداری نہیں کی گئی۔ حتیٰ کہ عصری جنگی اصول وضوابط مرتب کرنے، منضبط کرنے، نافذ کرنے اور پاسداری کرنے وکروانے کے علمبردار سب سے زیادہ زور ہی بچوں کے حقوق، عورتوں کے حقوق، انسانی حقوق بلکہ جانوروں تک کے حقوق ادا کرنے پر دیتے ہیں لیکن جب عملی طور پر نفاذ کی بات کی جائے تو جہاں اسلام یا مسلم قوم کے کسی فرد کا نام آجائے وہاں جانوروں کے برابر بھی حقوق دینے کو تیار نہیں ہوتے۔

یہاں بحث مسلمانوں کے حقوق یا جانوروں کے حقوق کی ادائیگی کی نہیں کی جارہی بلکہ اس یک طرفہ اپنائے گیے رویے کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے جس میں خود ساختہ قواعد کے مطابق حقوق دلائے جاتے ہیں جبکہ مساویانہ روش کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے حالانکہ اسلام کسی بھی سطح پر دوُرخی رویہ اپنانے کا درس نہیں دیتا۔ اسلام ایک ہی ریاست کی حدود کے اندر رہنے والوں کو یکساں اور مساوی حقوق نہ صرف دیتا ہے بلکہ قوانین کے ذریعے یقینی بناتا ہے کہ کسی کی حق تلفی تو نہیں کی جارہی اور اگر کہیں حق تلفی ہورہی ہے تو اُس کا تدارک بھی مساوی وعادلانہ انداز میں کرتا ہے کہ اسلام کا مخالف بھی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لامحالہ! عصری مسائل کا حل بھی دین اسلام کے دامن میں ہی پنہاں ملتا ہے کہ اگر دنیا میں امن، رواداری اور ہم آہنگی کو پروان چڑھانا ہے تو اسلام کو ہی محور ومرکز بنانا ہوگا تبھی جاکر ہر انسان کو اس کے بنیادی حقوق نہ صرف کامل صورت میں ملیں گے بلکہ عملی طور پر بسر وچشم مشاہدہ کیا جاسکے گا کہ اخوت، مساوات، عدل اور رواداری کا جو مظاہرہ اِن اصولوں کی روشنی میں سامنے آیا ہے، اُس کی نظیر کسی اور قوم کے تاریخی ورثے کا مقدر نہیں، یہ خاصا صرف دین اسلام کے ماننے والوں کا ہی ہے اور انہی کو زیبا دیتا ہے کہ وہ دنیا کی رہبری ورہنمائی کا فریضہ سرانجام دیں کیونکہ اُنہوں نہ صرف دنیوی معاملات کے حوالے سے بارگاہِ الٰہیہ میں جواب دینا ہے بلکہ خود پر عائد ذمہ داریوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی کہ فلاں حکمران کے دورِ حکومت میں فلاں فرد کی دل آزاری کی گئی، اس کا جواب دیا جائے، فلاں شخص کی موجودگی میں اختیارات رکھتے ہوئے بھی اُس نے ظلم وستم کو بزور بازو، زبان نہیں روکا، جواب دیا جائے۔

تو ایک مسلمان کی زندگی صرف اسی دنیا کی ظاہری حیات تک محدود نہیں بلکہ اُسے کل بروز قیامت اپنے ساتھ ساتھ دیگر افراد کے بارے میں بھی صفائی پیش کرنی ہے لہذا یہ کہنا بجا طور پر درست ہوگا کہ جسے دوجہانوں میں جواب طلبی کی فکر لاحق ہوگی وہی بہتر انداز میں فرائض کی ادائیگی کر سکتا ہے اور اُسے ہی رہبری دی جانی چاہیے تاکہ عالمگیر سطح پر اخوت ومساوات کے اصولوں کو نافذ کرسکے اور امن، رواداری اور ہم آہنگی کے ماحول کو پروان چڑھا سکے کیونکہ دین اسلام نے ہی اس حوالے سے اپنے ماننے والوں کو خصوصی طور پر ہدایت دی ہے کہ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْاؕ-اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْؕ [32]

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قومیں اور قبیلے بنایا تاکہ تم آپس میں پہچان رکھو، بیشک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے۔

لہذا! مذکورہ بالا عالمگیر اصول ہی بقائے باہمی کا واحد کلیہ ہے جس کے ذریعے مساوات اور باہمی شناخت کو انسانی تعلقات کی بنیاد قرار دیا گیا ہے اور اسی میں انسان وانسانیت کی بقا کا راز مضمر ہے۔

32 - الحجرات 49: 13

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

7۔فساد سے اجتناب

خالقِ ارض وسماوات نے انسان کو زمین پر بسایا تا کہ اُس کی آزمائش کی جاسکے کہ وہ کس طرح کے اعمال سرانجام دیتا ہے اور انہی کی بنیاد پر اُسے جزاوسزا سے نوازہ جائے گا۔اس امتحان کی تیاری میں سبھی طرح کے وسائل فراہم کیے گیے۔اُسے زندہ رہنے کے لیے خوراک کی ضرورت تھی وہ زمین سے اُگائی گئی،انسان کو رہنے کے لیے چھت کی ضرورت تھی تا کہ موسمیاتی اثرات سے و دیگر مسائل سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔اس معاملہ کو انجام دینے کے لیے جتنے وسائل درکار تھے وہ سب کے سب زمین میں موجود ہیں۔بدن ڈھانپنے کے لیے کپڑے کی ضرورت تھی،اُس کے لوازمات کا بھرپور انتظام کیا گیا۔سانس لینے کے لیے صاف آب وہوا کی ضرورت تھی،آلودہ آب وہوا کو صاف کرنے لیے، زمین میں پانی کو صاف کرنے کی قدرتی صلاحیت اور درختوں کا کاربن ڈائی آکسائیڈ کو خوراک کے طور پر استعمال کرنا،سورج کا روشنی فراہم کرنا،چاند کا تاریک رات کو روشن کرنا،ستاروں کا دوران سفر رہنمائی فراہم کرنا وسمت کا تعین کیا جانا وغیرہ۔

الغرض جس طرح کی ضرورت وخواہش انسان کو درپیش ہوتی یا ہوگی اس کے متعلقہ سبھی عوامل کو وافر مقدار میں فراہم کیا گیا تا کہ انسان اپنے امتحان کے دوران اپنے اعمال پر خوب غوروخوض کرے اور انہیں بہتر سے بہترین انداز میں ادا کرے جس کے لیے عقل ووحی الٰہی جیسے انعامات سے بھی اُسے نوازہ گیا تا کہ جہاں اُسے اپنے فہم کے مطابق معاملہ کو حل کرنا ہو وہ کرلے اور جہاں اُس کی عقل درست فیصلہ نہ کرپائے وہاں وحی الٰہی کی روشنی میں جائزہ لے لے تا کہ صحیح سمت وعمل کا تعین ہوسکے۔عقل کے ذریعے اُن دستیاب وسائل کو بروئے کار لانا خود بھی مستفید ہونا اور دوسروں کے لیے کار خیر جاری کرنا،انسان کے دائرہ اختیار میں رکھا گیا۔وحی الٰہی کے ذریعے اُسے وقتاً فوقتاً آگاہ کیا جاتا رہا کہ اُس کے اخلاق میں جو بگاڑ آچکا ہے اس کی اصلاح کیسے ممکن ہے؟اس کے معاش میں جو ملاوٹ ہوچکی ہے،اُسے کیسے پاک کیا جاسکتا ہے؟اُس کے سماجی ومعاشرتی معاملات میں کہاں سُدھار کی ضرورت ہے؟اور اُس کی فکر ونظر کہاں دھوکہ کھاچکی ہے یا کھانے کا امکان ہے یا مستقبل میں امید ہوسکتی ہے، سبھی جہات کے حوالے سے اُسے تنبیہی کی جاتی رہی اور آفاقی قوانین وضوابط کا انتظام دین اسلام کی صورت میں تاقیامت انسان کے لیے بہترین "اسوہ رسول اللہ ﷺ" کو متعین کردیا تا کہ جہاں بھی بھٹکے،جہاں بھی بہکے اور واپس صراط مستقیم کی طرف لوٹنا چاہیے تو رجوع کیا جاسکے۔

لیکن انسان کی سرشت میں ازل سے موجود "شر" کے عنصر نے اُسے ہمیشہ راہِ عدل سے دور لے جانی کی سرتوڑ کوشش کی ہے اور جب جب انسان نے اُس سرشت کی تابعداری اختیار کی ہے اِس نے خود کی ذات کو بھی ہلاکت میں مبتلا کیا ہے اور دوسروں کے لیے بھی عذاب کا گڑھا کھودا ہے۔اخلاقیات کو بھی رذائل سے لتھڑا ہوا بنالیا،معاش کو بھی حرام مال سے آلودہ کرلیا اور سماج ومعاشرے کو بھی دنگا وفساد سے بھر دیا۔پھر ناحق خون بہانا بھی اس کے لیے درست عمل ٹھرا اور اصول وضوابط کی دھجیاں اڑانا معمول عام بن گیا۔اِس نے دیگر انسانوں کو وہ دردناک اذیتیں دیں،وہ تکالیف دیں ،ایسی آزمائشوں میں مبتلا کیا کہ نوری وناری مخلوقات کو بھی پسینے چھڑوادے لیکن اس کے ظلم وستم نے تھمنے کا نام نہ لیا۔بچے،بوڑھے،معذور،عورتیں حتیٰ کہ دیگر مخلوقات بھی اس کے مظالم سے محفوظ نہ رہ پائی کہ روئے زمین کو اس نے فسادات سے بھر دیا ہے۔ہر کونہ آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہے،ہر آنگن سلگ رہا ہے۔ہر ذرہ سراپا احتجاج ہے اور دست بستہ عرض کناں ہے کہ اے انسان!ذرا رُک جا،تھم جا،تجھے یہاں آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے۔اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے سہولتیں پیدا کرنے کی ذمہ داری دی گئی ہے،تیرا مقام ومرتبہ نائب کا ہے، سبھی کچھ تیرے لیے مسخّر کردیا ہے گیا ہے لیکن تو اپنے ہی ہاتھوں سے ہلاکت وتباہی کا سامان اکٹھا کررہا ہے،تجھے واپس لوٹ کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور جزاوسزا سے نوازہ جانا ہے،تیرے اعمال انعام واکرام کے مستحق نہیں لگتے اور جہنم کے گڑھوں کی گہرائیوں کا تجھے اندازہ نہیں،اُس کی آگ،اُس کی تپش کی تو تاب نہ لاسکے گا۔کیوں خود کے ہاتھوں ہلاکت کا سامان جمع کیے جارہا ہے۔

ذرا رُک جا،تھم جا،غوروفکر کر اور اپنے خالق ومالک کی طرف رجوع کر تا کہ تیری اصلاح کا راستہ کھلے اور بروز قیامت حساب وکتاب میں آسانی پیدا ہو لیکن انسان کہاں ایسے فلسفیانہ اور عامیانہ باتوں پر کان دھرنے والا ہے،اُس کے سر پر فتح کا بھوت سوار ہے،اُسے دوسروں کو زیر کرنا ہے تا کہ اپنی انا،ضد اور ہٹ دھرمی کو تسکین دے سکے۔اُسے کھوپڑیوں کے مینار بنانے ہیں تا کہ تکبّر ورعونت کا اظہار کرسکے۔اُسے عورتوں،بچوں بوڑھوں اور معذوروں پر گولہ وبرود برسانا ہے تا کہ انہیں نیست ونابود کردے اور پھر دنیا کو دیکھا سکے کہ اُس سے بڑا سخت گیر حاکم کوئی نہیں اور کوئی بھی اُس کے مقابلے کی سکت نہیں رکھتا،وہی اس زمین کا اصلی مالک ہے اور اُسے کامل اختیار ہے کہ وہ جو چاہے فیصلہ کرے اور جیسا چاہے اُس فیصلے کو نافذ کرے اور جس پر چاہے عذاب بن کر نازل ہوجائے اور جسے چاہیے اپنے قرب سے نواز کر دوسروں سے ممتاز کردے۔

گر انسان سوچے تو یہی اُس کے لیے آزمائش کے لمحات ہوتے ہیں کہ وہ خون بھی بہائے تو اس کے لیے وحی الٰہی کو اپنا رہبر ورہنما رکھے،کسی کا حق چھینے تو بھی اِسی کی روشنی میں کہ وہ حق ناحق کسی کا دبالیا گیا تھا اس لیے چھین کر حقدار کو اُس کا حق دیا گیا ہے۔وہ کسی کو معاف بھی کرے تو اس انداز میں کرے کہ کسی کی طرف داری کا عنصر نمایاں نہ ہو۔کسی کو عطا کرے تو بھی وحی الٰہی کی تعلیمات اُس کے پیش نظر رہیں اور کسی کو محروم رکھے تو بھی ربّانی احکام سیرت طیبہ کی روشنی میں کامل طور پر جلوہ افروز ہوں جس سے خود کی اصلاح بھی ہوگی،سماج بھی درست سمت میں چلے گا،فکر ونظر میں وسعت ودلپذیری پیدا ہوگی اور یوم آخرت میں حساب وکتاب بھی آسان تر ہوجائے اور یہ سب کچھ تبھی ممکن ہے جب قرآن حکیم کے فرامین کو مطمع نظر رکھا جائے گا۔جیسا عمل کرنے کی ترغیب

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

قرآن مجید نے دی ہے ویسا ہی عمل کرنے کی کوشش کی جائے اور جہاں رُکنے کا کہا گیا ہے وہاں پر اپنی قلب و نظر اور سر تا پا بدن کو بھی روک لیا جائے تبھی یہ کرّہ ارض امن، رواداری اور ہم آہنگی کا عملی نمونہ بن پائے گا جیسا کہ قرآن الکریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ

وَ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَ ادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا[33]

اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ اس کے سنورنے کے بعد اور اس سے دعا کرو ڈرتے اور طمع کرتے

قرآن حکیم، فساد فی الارض (ظلم، بے انصافی، ماحولیاتی بگاڑ) کو امن کے منافی قرار دیتا ہے لہذا ایسے عوامل کے تدارک کے لیے عملی کوششیں بروئے کار لائی جانی چاہیے۔

8۔ وعدوں اور عہد کی پاسداری

انسانوں کے باہمی معاملات کو ہر معاشرے میں اہمیت دی جاتی ہے۔ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جو اخلاقی اصولوں کی پاسداری کرے اُسے عزّ و شرف سے نوازہ جاتا ہے، تعظیم کی جاتی ہے اور ہر جگہ ایسے شخص کی بات کو معتبر مانا جاتا ہے لیکن یہ عوامل صرف دنیوی زندگی کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں جیسے ہی ایسا کوئی معزز فرد دار فانی سے کوچ کرتا ہے، اس کے ساتھ ہی اخلاقیات کے دروس قصہ پارینہ بنتے جاتے ہیں اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ شخص ماضی کی گرد میں گم ہو جاتا ہے لیکن اسلام نظام زندگی کا فلسفہ کچھ منفرد و الگ تھلگ ہے۔ یہ انسان کو سماجی سطح پر اخلاقی اصولوں کی صرف پاسداری کرنے کی ترغیب نہیں دیتا بلکہ دنیا و آخرت میں اجر و ثواب کا موجب بھی قرار دیتا ہے کہ ایسے فرد کا اجر صرف یہ نہیں کہ لوگ اُسے عزّ و شرف سے نوازیں، ہر جگہ اُس کی واہ واہ کی جائے اور جب دنیا سے چلا جائے تو سب ختم شد بلکہ اسلام ایسے تمام انسانوں کو آخرت کے اجر کی نوید بھی سناتا ہے کہ جب ایسے لوگ قیامت کے دن رب تعالیٰ کے حضور حاضر کیے جائیں گے تو ان کے دنیوی اعمال کی بہترین جزا سے انہیں نوازہ جائے گا۔

نہ صرف دنیا میں اُن کا مقام و مرتبہ بلند رہے گا بلکہ آخرت میں بھی بلند مقام و مرتبہ ان کا منتظر ہو گا لہذا اسلام اپنے ماننے ولوں کی فکر میں انقلاب برپا کر دیتا ہے کہ زندگی صرف دنیا میں کچھ عشرے گزارنے کا نام نہیں بلکہ ابدی زندگی اس کے بعد شروع ہونے والی ہے اور اس زندگی میں جو انعامات عطا کیے جائیں گے وہ ابدی ہوں گے، جن اعلیٰ درجات سے نوازہ جائے گا وہ ہمیشہ رہیں گے اور اُس دنیا کی زندگی ایسی زندگی ہو گی جسے کسی طرح کا زوال نہیں بلکہ اندیشہ زوال بھی نہیں ہو گا۔ لہذا کیوں نہ اُس دنیا کے زندگی کے لیے بھی اتنی ہی جدوجہد کی جائے جتنی اِس دنیا کی آسائشوں کو حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں اور یہی سے زندگی گزارنے کا لائحہ عمل تبدیل ہو جاتا ہے پھر وہ دیگر معاملات کے ساتھ ساتھ آپس کے گیے وعدے اور عہد کو پورا کرنے کی کامل کوشش بروئے کار لاتا ہے کیونکہ اُسے صرف لوگوں سے معاملات کو سُدھارنا نہیں ہے بلکہ اُن امور کے باعث مالک کون و مکاں سے اجر و ثواب بھی طلب کرنا ہے اور یہی حقیقی کامیابی ہے جس کے لیے ہر ذی شعور کو کوشش کرنی چاہیے اور جب ہر فرد اِسی تگ و دو میں جُتا رہے گا تو لوگوں کے باہمی معاملات خود بخود ہی سنورتے چلے جائیں گے اور معاشرہ امن، رواداری اور ہم آہنگی کا مظہر عظیم بن جائے گا جس کے لیے قرآن حکیم میں بنیادی اصول بیان فرمایا گیا ہے کہ

وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا[34]

اور عہد پورا کرو بیشک عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

عہد کی پاسداری کے سبب نہ صرف شخصی وقار بلند ہوتا ہے بلکہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر بھی ملک و قوم کا وقار بلند تر ہو جاتا ہے اور یہی طرزِ عمل دیگر اقوام کی طرف سے اپنانے جانے پر دنیا میں امن کے قیام کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

9۔ ایمان سے باطنی سکون

عصر حاضر میں دیگر عوارض کے ساتھ ساتھ ڈپریشن، پریشانی یا ذہنی کلفت بھی ایک اہم مرض بن چکا ہے جس کے سبب آج کا انسان ہر لمحہ مضطرب، چڑچڑا اور اکتایا ہوا رہتا ہے۔ ہر دوسرے انسان کے ساتھ اس کا جھگڑا اور تیسرے انسان کے ساتھ بد تہذیبی و بد کلامی کا رویہ اپنائے ہوئے ہے اور پھر یہ روش ایسی عادت بن گئی ہے جو ہر گزرتے دن کے ساتھ پختہ تر ہوتی جا رہی ہے جس سے چھٹکارہ پانا اُس کے بس میں نہیں رہتا لیکن یہ مرض لاعلاج بھی نہیں۔ اس کے اسباب کو سمجھنا، جائزہ لینا اور تدارک کا لائحہ عمل مرتب کر کے اُس پر سختی سے کاربند رہنا موروثی عوارض کو بھی ختم کر دیتا ہے لہذا اس مذکورہ سابقہ پریشانی کا حل بھی موجود ہے جس کے لیے ہر مذہب و مسلک کے ماننے والوں کو الٰہی ہدایات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا کیونکہ جس بھی مذہب و مسلک کا حقیقی تعلق رب تعالیٰ کی ذات والاصفات سے ہو گا یہ یقینی امر ہے کہ اُس میں انسانی جان کی حرمت کو مقدم بیان کیا گیا ہو گا۔

33 ۔الاعراف 07: 56
34۔ السراء 17 : 34

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

کسی بھی مذہب سے ایسی ہدایات کا موجود ہونا کہ جن میں دوسرے انسانوں کا خون ناحق بہایا جاسکے ،انسان کی خود ساختہ اختراعات کا شاخسانہ تو ہو سکتا ہے فطری قوانین کا جزو نہیں۔لا محالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان کی ذہنی وجسمانی تکالیف کا علاج اُسی کی مذہبی کتب میں درست انداز میں لکھا ہونے کی صورت میں موجود ہے اور اس ساری بحث کا مطلوب نظر یہی مقصد ہے تا کہ آج کے انسان کو باور کروایا جاسکے کہ جب تک وہ اپنے ذہنی انتشار وخلفشار کا علاج نہیں کروائے گا تب تک اُس کا پُر سکون ہونا ممکن نہیں اور جب تک انسان ذہنی طور پر پُر سکون نہیں ہو گا تب تک آسودگی کی زندگی بسر نہیں کی جاسکتی اور جب زندگی کے معمولات میں بھنچال ہو گا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ فرد معاشرے میں مفید اور مثبت کردار ادا کر سکے اور جب تک سماجی زندگی میں فرد کا کردار تعمیری نہیں ہو گا، معاشرہ امن کا گہوارہ نہیں بن سکتا اور جب معاشرہ بدامنی کا شکار ہو گا تو رواداری کو پروان چڑھانا ممکن نہیں اور جب تلک رواداری کا چلن عام نہیں ہو گا باہمی ہم آہنگی کا ماحول پیدا کرنا دیوانے کا خواب ہی رہے گا اور دیوانے کے خواب کو لوگ مشعلِ راہ نہیں بناتے اور جب لوگوں کے پاس مشعلِ راہ نہیں ہو گی تو وہ اندھیرے میں بھٹکتے رہیں گے اور جب لوگ غلط راستوں پر چلنے کی وجہ سے بھٹکیں گے تو زمین پر فساد برپا ہو گا اور جب فساد برپا ہو گا تو کسی بھی جان ،مال اور عزت وآبرو محفوظ نہیں رہ سکے گی اور جب یہ سب محفوظ نہیں رہے گا تو انسانی حیات جنگلی جانوروں سے بھی بدتر ہو جائے گی، ہر طرف افراتفری کا ماحول ہو گا، خون خرابہ ہو گا، نفسا نفسی کا عالم ہو گا اور جس کے ہاتھ میں جو لگے گا وہ اُسی کا مالک بن بیٹھے گا۔

مختصراً کہا جائے تو انسان! حیوانات سے بھی بدتر ہو جائے گا جبکہ انسان کو تو اشرف المخلوقات کے مقام پر فائز کیا گیا ہے لہذا اس مقام ومرتبہ کا تقاضا ہے کہ اپنے اعمال کی اصلاح کی جائے اور جب اعمال کے اصلاح کی بات آئے تو دین اسلام سے بڑھ کر کوئی بھی مذہب ومسلک معتبر ومؤقر نہیں کہ جس نے زندی کے ہر گوشے کو تفصیل کے ساتھ بیان نہ کیا ہو۔ پھر چاہیے وہ انفرادی زندگی کا معاملہ ہو، خاندانی نظام زندگی ہو، گلی ومحلے یا ہمسائے کے حقوق ہوں، علاقے یا ملک سے منسلک معاملات ہوں یا بحیثیت قوم وقبیلہ معاملہ درپیش ہو، ہر گوشہ ہائے حیات کو بڑی باریک بینی سے مفصل بیان کیا گیا ہے تا کہ انسان کسی بھی موقع پر خود کو تنہا محسوس نہ کرے اور وہ رب تعالیٰ کہ رحمت سے مایوس نہ ہو جائے۔ لہذا سیرت نبوی ﷺ سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہے تا کہ ظلمات میں گرے ہوئے انسانوں کی روشنی سے متعارف کروایا جائے اور اس کے لیے سب سے پہلے قرآن حکیم سے رجوع کرنا پڑے گا جس کے لیے فرمان باری تعالیٰ ہے کہ

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِؕ-اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔[35]

(ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے) جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے چین پاتے ہیں، سن لو! اللہ کی یاد ہی سے دل چین پاتے ہیں۔

مذکورہ آیت قرآنیہ سے عیاں ہو گیا کہ انسان کا اندرونی سکون ہی بیرونی امن کی اصل بنیاد ہے۔

نتیجۃ البحث

قرآنِ حکیم! امن، رواداری اور بین المذاہب ہم آہنگی کا جامع فلسفہ اور عملی امثال پیش کرتا ہے۔ امن کا ماحول عدل کے نظام کو قائم کرنے سے پیدا ہوتا ہے، رواداری کا چلن عام بقائے باہمی کے رشتوں کو مضبوط کرتا ہے، اور بین المذاہب ہم آہنگی کا طرزِ ہائے حیات انسانی تنوع کو احترام بخشتا ہے جس سے عیاں ہوتا چلا جاتا ہے کہ قرآن کا یہ پیغام موجودہ دور کے گھمبیر مسائل جیسا کہ تشدد وتشدد پسندی، مذہبی وذاتی تعصب اور تہذیبی وثقافتی تصادم سے متعلق امور کا ایک مستقل اخلاقی وروحانی حل احسن انداز میں پیش کرتا ہے جسے ہر فرد، معاشرہ اور سماج کو اپنانا چاہیے تا کہ بڑھتی ہوئی کشیدگیوں کو کم کیا جاسکے اور لوگوں کی زندگیوں کو اجیرن ہونے سے محفوظ رکھا جاسکے۔

35 ۔الرعد 13: 28